دون کا سبزہ

(کہانیاں)

رسکن بونڈ

مترجم

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی

دون کا سبزہ (کہانیاں)
رسکن بونڈ
پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا شمار اُردو کے ممتاز نقادوں اور معروف دانشوروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم دہلی یونیورسٹی سے مکمل کی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ موصوف جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، نئی دہلی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ دہلی یونیورسٹی میں یو جی سی فیلو، پھر انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ کے پوسٹ ڈاکٹورل فیلو رہے بعد ازاں وہ یونین پبلک سروس کمیشن (UPSC) نئی دہلی سے منتخب ہوئے اور اُردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر، سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویئز (حکومت ہند) کے شعبہ تدریس سے بحیثیت پروفیسر وابستہ ہوگئے، اعلیٰ سطح پر تحقیقی کام کرتے رہے اور پرنسپل کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ علاوہ بریں وہ ویسٹرن ریجنل لینگویج سینٹر بھونیشور (حکومت ہند) اور نارتھ ایسٹرن ریجنل لینگویج سینٹر گوہاٹی (حکومت ہند) میں بھی پرنسپل کے عہدوں پر فائز رہے بعد ازاں سینٹر فار پروفیشنل ڈیولپمنٹ آف اردو ٹیچرس (اردو اکادمی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ڈپٹی ڈائریکٹر منتخب ہوئے۔ ان دنوں ڈاکٹر صدیقی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں اور درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی مشرقی طرز کے نقاد ہیں اور گذشتہ تین دہائیوں سے اردو زبان وادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ اردو تحقیق وتنقید کے موضوع پر اب تک ان کی دو درجن کتابیں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ چند کتابیں یونیورسٹیوں اور اسکولوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ، معروضات، دہلی کے اردو ادارے، ارمغان تحقیق، اردو ہندی ڈکشنری، اردو کا فاصلاتی نظام تعلیم، تحریک آزادی اور اردو نثر جنم دن ترجمہ، دون کا سبزہ اور اسالیب فکر ان کی اہم تصانیف ہیں۔ چند اداروں نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں ایوارڈ سے بھی نوازا ہے۔ پروفیسر صدیقی نے ساہتیہ اکادمی نئی دہلی اور نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی کی بعض اہم کتابوں کا انگریزی سے اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔ موصوف نے گورنر ریاست ہماچل پردیش کے اردو مترجم Interpreter کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دی ہیں۔ بحیثیت صحافی بھی ان کی شناخت ہے۔ انھوں نے ایڈیٹر دانش و جوائنٹ ایڈیٹر سہ ماہی فکر ونظر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، فکر وفن شملہ ہماچل پردیش اور مدیر اعلیٰ اعتراف اورنگ آباد (مہاراشٹر) انٹرنیشنل اُردو جرنل 'ورثہ' نیویارک کے ایڈیٹر کی ذمہ داری بھی قبول کی۔

یو جی سی HRDC شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے SWAYAM PORTAL پر یونیورسٹی اساتذہ کے لیے اردو ریفریشر کورس کے کوآرڈینٹر کے طور پر بھی کام کیا۔

دون کا سبزہ

رسکن بونڈ

مترجم: ضیاءالرحمٰن صدیقی

ورثہ
فاؤنڈیشن انٹرنیشنل
WARSA FOUNDATION
INTERNATIONAL

ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ انگریزی کہانیاں

دون کا سبزہ

(کہانیاں)

مصنّف

رسکن بونڈ

مترجم

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی

وارثہ

فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

WARSA FOUNDATION

INTERNATIONAL

Doon Ka Sabza : Urdu translation by Prof. Zia-ur-Rahman Siddiqui (AMU) of Sahitya Akademi's award winning English stories *Our Trees Still Grow in Dehra* by Ruskin Bond. 2024, Rs.

© ساہتیہ اکادمی

ایڈیشن 2024

نام کتاب	:	**دون کا سبزہ**
مصنف	:	رسکن بونڈ
مترجم	:	ضیاء الرحمٰن صدیقی
مطبع	:	
قیمت	:	
ISBN	:	81-260-1941-7
سرورق	:	
زیر اہتمام	:	

ترتیب

میپل وڈ: ایک تعارف	7
جاوا سے فرار	13
کبڑا بھکاری	34
اچھوت	42
ادنیٰ و اعلیٰ مخلوقات	47
دہرہ دون کو واپسی	61
خواہش	70
تانگے کا آخری سفر	73
کلپسو کرسمس	89
دہلی کا آخری سفر	94
وہ بھی کیا دن تھے	100
اور بینا چلی گئی	105
اور وقت گزر گیا	117
ابتدائی کہانیاں	122
مرگِ شجر	136
جنون	139

♦♦♦

WARSA FOUNDATION INTERNATIONAL

دہرہ کی واپسی

ہاں! یہ وہی پرانا دہرا ہے جہاں دھوپ کے رُخ پر میرے ابّا نے آم اور لیمو کے پودے لگائے تھے اور میں نے اُن پودوں کے قریب شریفے کے پیڑ اُگائے تھے۔

ہمارا گھر میجر جنرل مہرا کو فروخت کر دیا گیا اور ہمیں اپنے ہی شہر میں اجنبیت کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہاں کے لوگ بھی اب ہمیں بہت کم پہچانتے تھے اور میری ماں کی مسکراہٹ کو تو وہ بھول ہی چکے تھے۔ ہمارے گھر پر بھی لوگ اجنبی کی طرح آتے جاتے تھے۔

لیکن میرے ابّا نے دہرہ کے گھر میں جو پودے لگائے تھے وہ آج بھی درخت کی شکل میں وہاں موجود ہیں۔

•••

WARSA FOUNDATION INTERNATIONAL

میپل وڈ: ایک تعارف

میپل وڈ چھوڑے ہوئے ابھی مجھے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، پھر بھی یہ جان کر کوئی تعجب نہیں ہوا کہ میپل وڈ کا ٹیج اب وہاں نہیں رہا۔ پچھلے مہینے جب میں دہرہ گیا تھا تو پیڑ کٹنے شروع ہو گئے تھے اور کاٹیج کے نیچے سے پہاڑی کو کاٹ کر نئی سڑک نکالنے کا کام شروع کر دیا گیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس وقت کاٹیج کو توڑنے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ لیکن وہ کاٹیج اتنا بوسیدہ اور پرانا ہو گیا تھا کہ ٹرک کے گزرنے، ڈرل کے چلنے یا بلڈوزر کے جھٹکے سے کسی بھی وقت زمین پر گر سکتا تھا۔ اگر یہ کاٹیج گرا بھی دیا گیا تو مجھے اس بارے میں کچھ کہنے، کسی کو لکھنے یا مزید جاننے میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔

جب میں کاٹیج کے ایک دوسرے حصے میں داخل ہوا تو وہاں شاہ بلوط کے پیڑوں پر ستّر سال پرانے گھونسلے موجود تھے اور اب تو وہ جنگل کا ایک حصہ بن چکے تھے۔ پرندوں نے باقاعدہ اپنے گھونسلوں کے لیے جگہ بنالی تھی۔ بھنورے بھی لکڑی کے اندر اپنے رہنے کی جگہ بنا چکے تھے۔ مٹی نے کھپریل کے اوپری حصّے میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ نئے پودے جو میری رہائش کے دوران نکلنے شروع ہوئے تھے اب وہ بھی پیڑ بن چکے تھے۔ میں نے اس کاٹیج میں اپنی زندگی کے آٹھ نو سال گزارے تھے۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ جگہ میرے رہنے کے لیے مناسب تھی بھی یا نہیں، شاید اسی لیے کہ میں سال میں ایک بار اپنی سہولت کے مطابق کرایہ دیتا تھا۔

WARSA FOUNDATION INTERNATIONAL

میں نے پہلی بار اس کاٹیج کو موسمِ بہار کے آخری دنوں میں دیکھا تھا۔ ان دنوں جنگل بہت ہرا بھرا ہوتا تھا اور وہاں شاہ بلوط اور میپل کے پیڑ تھے۔ ہمالہ میں پائے جانے والے میپل کی نئی پتیاں سرخ اور سنہری ہوتی ہیں۔ ہمالہ کے میپل کی یہ قسم شمالی امریکہ کے میپل سے مختلف ہوتی ہے۔ دونوں میں صرف پَر والے بیج کی یکسانیت ہوتی ہے جو ہوا کے چلنے پر پتوں کے مڑنے سے زمین پر گر جاتے ہیں اور چاروں طرف اُڑتے رہتے ہیں۔ گڑھوال کے لوگ اس پیڑ کو 'بٹر فلائی' کے نام سے پکارتے ہیں۔ کاٹیج کے قریب ایک بہت پرانا اور اونچا میپل تھا۔ شاید اس پیڑ کے نام پر ہی اس گھر کا نام میپل رکھا گیا ہو گا۔ اس کا ایک حصّہ بجلی گرنے سے کالا پڑ گیا تھا۔ میپل کے چاروں طرف کٹک بڑھئی چکّر لگاتے رہتے تھے اور خوشی سے میٹھے میٹھے نغمے گایا کرتے تھے۔

کاٹیج میں جانے کے لیے نیچے کی طرف ایک ڈھلواں راستہ بنا ہوا تھا۔ برسات کے دِنوں میں اس راستہ پر بہت تیز پانی بہتا تھا۔ پانی کے تیز بہاؤ کی وجہ سے زمین تو دھل جاتی تھی لیکن راستہ پتھریلا اور اوبڑ کھابڑ ہو جاتا تھا۔ اسی راستے سے ہو کر میں مس میکینزی سے ملنے گیا تھا۔ وہ ایک نادار اور کمزور عورت تھی۔ اس کاٹیج میں مس میکینزی کے پاس رہنے کے لیے دو کمرے تھے۔ مالک مکان نے اس کاٹیج کی دیکھ ریکھ کی ذمّے داری مس میکینزی کے سپرد کر رکھی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ کاٹیج کا اوپر کا کمرا کرایے کے لیے خالی ہے اور نیچے کے حصے میں وہ خود رہتی ہے۔

کاٹیج کا ایک راستہ نیچے کی طرف جاتا تھا اور دوسرا راستہ اوپر کی طرف پہلی منزل کے دروازے تک پہنچتا تھا۔ گراؤنڈ فلور پر پہاڑی کی وجہ سے دھوپ بھی نہیں آتی تھی۔ تیز بارش کے زمانے میں راستے میں پانی بھرا رہتا تھا جس سے گھر کے اندر پہنچنا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔

مِس میکینزی کی عمر چھیاسی سال ہو چکی تھی۔ میری مدد سے سیڑھیاں چڑھ کر انھوں نے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور وہ مجھے 'ایل شیپ' روم میں لے گئیں۔ اس کمرے میں دو بڑی کھڑکیاں تھیں۔ میں نے پہلی کھڑکی کو زور سے کھولا تو دور تک پھیلا ہوا گھنا جنگل

دکھائی دیا۔ وہاں مجھے میپل، شاہ بلوط اور اخروٹ کے علاوہ اور بہت سے جنگلی پیڑ والہانہ انداز میں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے نظر آئے۔ ایک پیڑ کی ایک شاخ تو کھڑکی کے دروازے پر لٹکی ہوئی تھی۔ نیچے کی طرف کسی پرندے کے گلے سے نکلتی ہوئی تیز سیٹی کی آواز سنائی دی۔

میں نے مِس میکینزی سے کہا کہ یہ جگہ مجھے پسند ہے۔ یہ سن کر انھیں بہت خوشی ہوئی۔ وہ کئی سال سے اس کاٹیج میں تنہا رہا کرتی تھیں اور اس کاٹیج کا اوپری حصہ بہت دنوں سے خالی پڑا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ ان کا ایک پرانا نوکر اور مخلوط نسل کا ایک کتا رہتا تھا۔ مس میکینزی نے کچھ رقم لے کر اپنا گھر رہن رکھ دیا تھا۔ ان کے بھائی بہنوں کا بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ مس میکینزی کا اس دنیا میں اب کوئی نہیں تھا اور وہ تنہا زندگی گزار رہی تھیں۔ یہ سب باتیں انھوں نے مجھے بتائی تھیں۔

میں نے ان سے کہا کہ میں جلد ہی اس کاٹیج میں رہنا شروع کر دوں گا۔ میری کتابیں ابھی دہلی میں پڑی ہوئی ہیں۔ میں نے مس میکینزی کو ایک چیک دیا اور انھوں نے اس کمرے کی چابی میرے حوالے کر دی۔ یہ سب کچھ جذباتی طور پر ہو گیا۔ میں نے دہلی میں نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور ہل اسٹیشن پر ایک سستا مکان کرائے پر لے کر ایک پیشہ ور ادیب کے طور پر لکھنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد مجھے پیسے کی کمی محسوس ہوئی اور ایسا لگا کہ میرے خواب پورے ہونے مشکل ہو جائیں گے۔ اسی شش و پنج میں تھا کہ اگر میں پیسے آنے کا انتظار کرتا رہا تو اس انتظار میں میرے بالوں پر سفیدی چھا جائے گی اور میں بوڑھا اور کمزور ہو جاؤں گا۔ لیکن میری عمر ابھی پینتیس سال تھی۔ جوانی کے اس دور میں خطروں سے کھیلا جا سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں اپنے خوابوں کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں کس طرح میپل وڈ تک پہنچ گیا اور پہلی ہی نظر میں وہ جگہ مجھے پسند آ گئی۔ اس لیے میں نے کسی دوسری جگہ کی طرف توجہ نہیں دی کیونکہ اس جگہ کا محلِ وقوع بہت اچھا تھا۔ اس کا رخ مشرق کی جانب تھا اور سامنے بالا حصار کی پہاڑی دکھائی

دیتی تھی۔ صبح کے نکلتے سورج کی دھوپ وہاں آتی تھی۔ لیکن شام کے ڈھلتے سورج کی دھوپ وہاں نہیں پہنچتی تھی۔ شام کو تین بجے سے پہاڑی کا سایہ کاٹیج کے اوپر آجاتا تھا اور سورج کی روشنی کاٹیج کی چھت سے آہستہ آہستہ ڈھلنے لگتی۔ گرمی کے موسم کے لیے یہ کاٹیج بہت اچھا تھا لیکن سردی کے موسم میں یہاں ٹھنڈا اور اندھیرا رہتا تھا۔

کاٹیج کی اس کھڑکی سے نہ برفیلی پہاڑیاں دکھائی دیتی تھیں اور نہ کوئی کھلا میدان۔ اس کے سامنے ایک جھلسی ہوئی پہاڑی تھی جسے لوگ پری ٹبّا کہتے تھے۔ بجلی کے بار بار گرنے سے پہاڑی کا وہ حصہ جھلس کر کالا پڑ گیا تھا۔ کمرے کی کھڑکیاں کھولنے پر کاٹیج کے نیچے دور تک پھیلے ہوئے گھنے اور ہرے بھرے جنگل کو دیکھ کر تمام طرح کے امکانات کا ازالہ ہو جاتا تھا۔ میرے رومانی ذہن کے لیے وہ ایک جادوئی اور حساس کھڑکی تھی۔

اس کھڑکی کے پاس میں نے اپنے بیٹھنے کے لیے ایک آرام کرسی بنائی تھی۔ گرمی کے دنوں میں اکثر میں اس پر دراز ہو کر شعر لکھتا اور انھیں گنگناتا رہتا تھا۔ مس میکینزی سے میں اپنے گزرے ہوئے زمانے کی باتیں کرتا۔ گفتگو کے دوران پریم اور دوسرے لوگ جیسے بینا وغیرہ کا بھی ذکر آجاتا تھا۔

کچھ عرصے کے لیے میں پہاڑیوں سے دور چلا گیا تھا لیکن بہت جلد واپس آ گیا۔ پہاڑوں سے آشنا ہونے کے بعد فطری طور پر ان سے ایک رشتہ قایم ہو جاتا ہے جو ہمیشہ باقی رہتا ہے، کیونکہ پہاڑوں کی خوبصورتی کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

میری بیشتر کہانیاں (جن میں میرے بچپن کا ذکر ہے) میپل وڈ میں لکھی گئیں۔ ان میں سے بہت سی کہانیاں The Night Train at Deoli اور Time Stops at Shamli میں شامل ہیں۔

زندگی سے جدوجہد کرنے والا یہ نوجوان ادیب ''رسکن بونڈ'' اس پرانے کاٹیج ''میپل وڈ'' کا آج بھی رہینِ منّت ہے۔

مسوری اکتوبر 1991

رسکن بونڈ

●●●

جاوا سے فرار

یہ سب کچھ دِنوں ہی میں ہو گیا۔ تیج پات کے پیڑوں پر ابھی پھول آئے ہی تھے کہ بٹاویا (موجودہ جکارتا) پر پہلی بمباری ہوئی اور گلیوں میں پڑے تباہ شدہ ملبے پر شوخ گلابی پتیوں کا ڈھیر لگ گیا۔

خبر پھیل گئی تھی کہ ''سنگاپور پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا۔ جلد ہی وہ جاوا پر بھی قابض ہو جائیں گے۔'' ابا کہہ رہے تھے: ''انگریزوں کی شکست کے بعد ولندیزی کیونکر فتحیاب ہو سکتے ہیں۔'' ابا ولندیزیوں کی برائی نہیں کر رہے تھے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ ولندیزیوں کے پاس وہ طاقت نہیں تھی جو انگریزوں کے پاس شہنشاہ ہونے کے ناطے تھی۔ سنگاپور کو مشرقی جزائر کہا جاتا تھا۔ سنگاپور کے ہتھیار ڈالنے کے بعد وہاں سے چلے جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ جنوب مشرق سے یورپ کے لوگوں کو نکلنا ہی تھا۔

دوسری جنگ عظیم کا دور تھا۔ جاپانی اس جنگ کے بارے میں کیا سوچتے تھے، میرے لیے کہنا مشکل تھا کیونکہ اس وقت میں صرف نو برس کا تھا اور ان باتوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ولندیزیوں کے بجائے جاپان حکومت کے تحت آجائیں گے۔ لیکن ابھی بھی کچھ ایسے لوگ تھے جو لڑائی ختم ہونے پر جاوا کی آزادی کے خواہاں تھے۔

ہمارا ہمسایہ مسٹر ہارٹونوان میں سے ایک تھا جو جاوا، سماترا اور دوسرے جزیروں کے

اتحاد کے خواب لے رہا تھا۔ وہ کالج میں پروفیسر تھا اور ڈچ، چینی، جاپانی اور کچھ کچھ انگریزی زبان بول سکتا تھا۔ اس کا لڑکا سونو میرا ہم عمر تھا۔ صرف وہی مجھ سے انگریزی میں گفتگو کر سکتا تھا۔ اس لیے زیادہ تر ہم دونوں ایک ساتھ ہی رہتے۔ ہمارا خاص مشغلہ پارک میں پتنگ بازی کرنا تھا۔

بمباری کی وجہ سے پتنگ بازی ختم ہوگئی تھی۔ دن رات ہوائی حملہ کا اعلان ہوتا رہتا تھا اور شروع میں چاہے بم بندرگاہوں کے پاس یعنی ہمارے گھر سے کچھ میل کی دوری پر گرتے تھے پھر بھی ہم گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ طیارے اگر نزدیک اور کم اونچائی پر ہوتے تو ہم پلنگوں اور میزوں کے نیچے چھپ جاتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ادھر ادھر کوئی خندق نہیں تھی، شاید خندق کھودنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو قبریں کھودنے کے لیے تھا۔ حادثات اتنی تیزی سے ہو رہے تھے کہ ہر کوئی (جاوا کے لوگوں کو چھوڑ کر) جاوا سے بھاگ جانے کی سوچ رہا تھا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' ہوائی حملوں کے رکنے کے بعد برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے تو سونو نے پوچھا۔

''پتہ نہیں۔ ابا کو پتہ ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''میرے ابا کا کہنا ہے کہ جاپانی ایک ہفتے کے اندر اندر یہاں آجائیں گے۔ تب تک اگر تم یہاں ہوئے تو تمھیں ریلوے لائن بچھانے کے لیے لگا دیں گے۔''

''میں ریلوے لائن ڈالنے سے انکار نہیں کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''مگر وہ تمھیں اتنی مزدوری نہیں دیں گے کہ تم پیٹ بھر کھا سکو۔ بس چند کپڑے اور تھوڑے چاول ہی ملا کریں گے اور اگر تم ٹھیک طرح کام نہیں کرو گے تو گولی سے اُڑا دیے جاؤ گے۔''

''ایسا تو سپاہیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہم تو غیر فوجی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو غیر فوجیوں کو بھی نہیں بخشتے۔'' سونو بولا۔

میرے ابا اور میں بٹاویا میں بھلا کیا کر رہے تھے جبکہ ہمارا اصل گھر تو بہت دور

انگلستان میں تھا؟ ابّا ربڑ کی تجارت کرنے والی ایک فرم میں کام کر رہے تھے۔ چھ ماہ پہلے ہی اُن کو بٹاویا میں ڈچ تاجروں سے مل کر ایک نیا دفتر کھولنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ میں اگرچہ چھوٹا تھا لیکن ہر جگہ ابّا کے ساتھ ہی جاتا تھا۔ میری ماں کا انتقال ہو چکا تھا اور میری پرورش ابّا کے ذمّے ہی تھی۔ جنگ کے بعد وہ مجھے انگلینڈ لے جائیں گے۔

''کیا ہم یہ جنگ جیت جائیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے تو نہیں لگتا۔'' وہ بولا۔

واقعی ایسا نہیں لگتا تھا کہ ہم جنگ جیت جائیں گے۔ میں ابّا کے ساتھ جہاز کے عرشے پر بندرگاہ پر کھڑا ہوا تھا کہ میں نے سنگاپور سے مہاجرین سے بھرے ہوئے جہازوں کو آتے دیکھا۔ ان میں مرد عورتیں اور بچے سبھی تھے جو بندرگاہ پر اس شدت کی گرمی میں پہنچے تھے۔ ان سب کے چہرے پیلے، تھکے ماندے اور پریشان کن تھے۔ وہ شاید کولمبو یا سے بمبئی جا رہے تھے۔ کوئی بھی بٹاویا میں داخل نہیں ہوا کیونکہ وہ انگریزوں کا علاقہ نہیں تھا بلکہ ولندیزیوں کے قبضہ میں تھا اور ہر کوئی جانتا تھا کہ زیادہ دن تک ولندیزیوں کے پاس بھی نہیں رہے گا۔

''ہم نہیں جا رہے کیا؟'' میں نے پوچھا۔ ''سونو کے ابّا کہہ رہے تھے کہ جاپانی کسی بھی دن یہاں آسکتے ہیں۔''

''ابھی ہمارے پاس وقت ہے۔'' ابّا نے کہا۔ میرے ابّا ناٹے قد کے اور گٹھیلے جسم کے تھے۔ وہ جلدی برانگیختہ نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی پریشانی کا اظہار کرتے تھے۔ ''ابھی مجھے دفتر کا کچھ کام کرنا ہے اس کے بعد ہی چل سکیں گے۔''

''مگر ہم جائیں گے کیسے؟ ان جہازوں پر تو ہمیں جگہ ہی نہیں ملے گی۔''

''ہاں ان میں گنجائش نہیں۔ تم فکر مت کرو بچے۔ کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔''

میں بالکل فکرمند نہیں تھا۔ مجھے مشکلات حل کرنے کے ابّا کے طریقوں پر پورا بھروسہ تھا۔ ابّا کہا کرتے تھے۔ ''ہر ایک مشکل کا حل کہیں نہ کہیں پوشیدہ ہوتا ہے۔ بس ذرا دھیان دینے کی بات ہے کہ راستہ مل جاتا ہے۔''

گلیوں میں اگرچہ انگریز سپاہی گھوم رہے تھے مگر ہم خود کو محفوظ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ فوجی بھی جہازوں کا انتظار کر رہے تھے جو اُن کو لینے آنے والے تھے۔ کوئی بھی جاوا کے تحفّظ میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ ان کی دلچسپی تو یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جانے میں تھی۔

حالانکہ جاوا کے لوگ ولندیزیوں کو ناپسند کرتے تھے، تاہم یورپیوں میں آپس میں کوئی دشمنی نہیں تھی۔ میں بنا کسی خطرے کے گلیوں میں گھوم پھر سکتا تھا۔ گاہے بگاہے چینی کوارٹروں کے چھوٹے بچے مجھے دیکھ کر شور مچاتے اور کہتے: ''اورانگ بلادی'' (ولندیزی) اور ایسا وہ بس مذاق کے طور پر کہا کرتے تھے لیکن میں ان کی زبان نہیں جانتا تھا کہ ان کو سمجھا سکتا کہ میں انگریز ہوں ولندیزی نہیں۔ اُن کی نظر میں سفید آدمی ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ کچھ حد تک وہ ٹھیک بھی تھے۔

ابّا کا دفتر نہر کے کنارے تجارتی علاقے میں تھا۔ ہمارا دو منزلہ مکان وہاں سے ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ ایک پرانی بلڈنگ تھی جس کی چھت لال سلیٹوں کی تھی۔ مکان میں وسیع بالکنی تھی جس کے دونوں طرف پتھر کے اژدہے کھڑے تھے۔ باغیچے میں تقریباً سارا سال پھول کھلتے رہتے تھے۔ بٹاویا پر بمباری کے علاوہ اگر کچھ اور تھا تو وہ بارش تھی جو ہر روز دوپہر کو گھروں کی چھتوں پر اور کیلوں کے پتوں پر گرتی تھی۔ جاوا کے اُبلتے ہوئے موسم میں بارش بڑی خوشگوار لگتی تھی۔

بٹاویا میں طیارہ شکن توپیں نہیں تھیں۔ جاپانی بمبار طیارے دن میں بے خوف و خطر آتے اور بم برساتے۔ کبھی کبھی بم شہر میں گرتے تھے۔ ایک دن ایک بم ابّا کے دفتر والی بلڈنگ پر گرا اور وہ دھڑام سے دریا میں جا گری۔ دفتر کے کئی لوگ مارے گئے۔

اسکول بند ہو گئے تھے۔ ہمارے پاس گھر میں بیٹھے رہنے کے سوا اور کوئی کام نہیں تھا۔ سونو اور میں یا تو تیر اندازی کا کھیل کھیلتے یا کیرم۔ کبھی غالیچوں پر کشتی لڑتے یا گراموفون پر گانے سنتے۔ ہمارے پاس گریسی، ہیری لارڈ، جارج فارم بی اور آرتھر آسکے جیسے

1940 کے تمام مشہور آرٹسٹوں کے ریکارڈ تھے۔ 'آرتھر آسکے' نے ایک گانے میں ہٹلر کا مذاق اس طرح اڑایا ہے۔ ''اڈولف ہٹلر! ہم تمھارے دھلے ہوئے کپڑے لائینوں پر ڈال رہے ہیں، اگر وہ ابھی موجود ہوں تو۔'' ہمیں یہ محسوس کر کے بڑی مسرت ہوتی تھی کہ برطانیہ میں لوگوں کو کامل یقین تھا کہ وہ جنگ جیت جائیں گے!

ایک دن سونو بولا، ''بمباری بٹاویا شہر میں ہو رہی ہے گاؤں میں نہیں۔ کیوں نہ ہم سائیکلوں پر شہر سے باہر چلیں۔''

مجھے اُس کی تجویز پسند آئی۔ صبح جب خطرہ ٹل گیا، ہم سائیکلوں پر شہر سے باہر نکل پڑے۔ میرے پاس تو کرائے کی سائیکل تھی اور سونو کے پاس اس کی اپنی تھی جو اس کے پاس اس وقت سے تھی جب وہ پانچ برس کا تھا۔ وہ تھوڑی بہت مرمت چاہتی تھی۔ ''اس کی روح تو پرواز کر چکی ہے۔'' وہ کہا کرتا تھا۔

ہم دونوں کے والد اپنے اپنے کام پر گئے ہوئے تھے۔ سونو کی ماں سودا سلف خریدنے گئی ہوئی تھی۔ (خطرہ کا الارم بجتا تو وہ کسی محفوظ دکان میں رُک جاتی)۔ وہ ایک گھنٹے سے پہلے لوٹنے والی نہیں تھی۔ ہم لنچ سے پہلے لوٹ سکتے تھے۔

چاولوں کے کھیتوں، اناس کے باغیچوں اور سنکونا کے درختوں کو یاد کرتے ہوئے ہم شہر سے باہر سڑک پر آ گئے تھے۔ ہمارے دائیں طرف ہری بھری پہاڑیاں تھیں۔ بائیں طرف ناریل کے پیڑ اور اُن سے پرے سمندر تھا۔ مرد اور عورتیں دھوپ سے بچنے کے لیے سر پر چوڑے ہیٹ پہنے ہوئے چاولوں کے کھیتوں کی دلدل میں گھٹنوں تک دھنسے ہوئے کام کر رہے تھے۔ یہاں وہاں اکا دکا بھینس کیچڑ میں لوٹ رہی تھی۔ ایک ننگا سا لڑکا ایک بھینس کی چوڑی پیٹھ پر سوار تھا۔ ہم نے کھجوروں کے پیڑوں کے بیچ اوبڑ کھابڑ سڑک پکڑ لی تھی۔ کھجور کے یہ پیڑ عین سمندر کے کنارے اُگے ہوئے تھے۔ ہم اپنی سائیکلیں وہیں کنکروں پر ٹیک کر ریتیلے ساحل پر دوڑتے ہوئے پانی میں چلے گئے۔

''زیادہ دور مت جانا۔'' سونو بولا۔ ''یہاں مگرمچھ ہو سکتے ہیں۔''

چٹانوں کے بیچ پانی میں ہم سیپیاں تلاش کرتے رہے۔ ایک چٹان پر بیٹھ کر سمندر کا

نظارہ کرتے ہوئے نیلے پانی میں ایک جہاز کو آتے دیکھ رہے تھے۔ یہ تصور کرنا مشکل تھا کہ نصف دنیا جنگ آلود ہے اور یہاں سے دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر بٹاویا بھی جنگ کا میدان بنا ہوا ہے۔

واپسی میں ہم نے چاولوں کے کھیتوں سے ہوتے ہوئے چھوٹا راستہ اختیار کیا لیکن ہماری سائیکلیں دلدل میں پھنس گئیں اور ہمیں گھر پہنچنے میں دیر ہونے لگی۔ ہم راستہ بھول گئے اور ایک انجان سڑک پر آ گئے۔ ابھی ہم شہر سے باہر ہی تھے کہ خطرے کا الارم بج اُٹھا۔ ساتھ ہی طیاروں کے اڑنے کی آواز ہمارے کانوں کو چیرنے لگی۔

''کیوں نہ سائیکلوں سے اُتر کر کہیں رک جائیں؟'' میں نے کہا۔

''نہیں، بھاگو۔ ہمیں گھر پہنچنا ہے۔ ہم ہمارے اوپر نہیں گرنے والے۔'' سونو نے کہا۔

لیکن وہ غلط تھا۔ طیارے بہت کم اونچائی پر تھے۔ تھوڑی دیر میں جاپانی طیاروں نے سورج کو ڈھک دیا تھا۔ ہم بہت تیز تیز پیڈل مار رہے تھے۔ ہم ابھی پچاس گز دور ہی گئے ہوں گے کہ ہمارے دائیں طرف گھروں پر بہت زبردست دھماکہ ہوا۔ اس دھماکے سے ہم چکر کھا کر سڑک پر آ گئے اور سائیکلوں سے گر پڑے۔ ہماری سائیکلیں ایک دیوار سے جا ٹکرائیں۔

میں اپنے ہاتھوں اور ٹانگوں میں شدید جلن محسوس کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کیڑے مکوڑے کاٹ رہے ہوں۔ میرے بدن پر جگہ جگہ خون کے دھبے تھے۔ سونو جانور کی طرح میرے پاس رینگ رہا تھا۔ اس کے ماتھے اور ہاتھوں پر بم کے چھرّوں نے زخم کر دیے تھے۔

ہم فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ٹوٹی ہوئی سائیکلوں کو سڑک پر چھوڑ کر سرپٹ گھر کی طرف بھاگے۔

''گلی سے باہر نکل جاؤ۔'' کوئی کھڑکی سے چلا رہا تھا۔ لیکن ہم اس وقت تک رُکنا نہیں چاہتے تھے جب تک گھر کے پاس نہ پہنچ جائیں۔ ہم اتنا تیز زندگی میں بھی نہیں

بھاگے تھے۔

میرے ابّا اور سونو کے والدین گلی میں اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے ہمیں آوازیں لگا رہے تھے کہ ہم دوڑ کر ان کی بانہوں میں سما گئے۔

''کہاں چلے گئے تھے تم؟''

''کیا ہو گیا تھا تمھیں؟''

''یہ زخم کہاں سے لگے؟''

ایک کے بعد ایک سوالوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم سنبھل پاتے اور ان سوالوں کا جواب دیتے وہ ہمیں گھر کے اندر لے گئے۔ میری چیخوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ابّا نے میرے زخموں کو صاف کر کے ان پر آئیڈین لگائی اور میرے چہرے پر پلاسٹر لگا دیا۔

سونو اور میں اس قدر خوف زدہ ہو گئے تھے کہ ہم پھر گھر سے باہر ایسی سیر پر نہیں نکلے۔

اس رات ابّا نے کہا۔ ''ہم شاید ایک دو دن میں چلے جائیں گے۔''

''دوسرا جہاز آ گیا ہے کیا؟''

''نہیں۔''

''تو کیا ہم ہوائی جہاز سے جائیں گے؟''

''دیکھتے جاؤ بیٹا۔ ابھی کچھ طے نہیں ہوا ہے۔ لیکن ہم اپنے ساتھ زیادہ سامان نہیں لے جا سکتے۔ سفر کے لیے صرف ضروری سامان ہی بیگ میں رکھنا ہوگا۔''

''اور وہ جو ٹکٹیں آپ نے اکٹھا کر رکھی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ابّا کا ٹکٹوں کا خزانہ بڑا قیمتی تھا اور کئی جلدوں میں تھا۔

''ان میں سے بہت ساری یہیں چھوڑنا ہوں گی۔'' ابّا نے کہا۔ ''شاید مسٹر ہارٹونو ان کو ہمارے لیے سنبھال کر رکھ لیں اور جب جنگ ختم ہو جائے اگر ختم ہوئی تو، ہم لوٹ کر واپس لے لیں گے۔''

''لیکن ایک دو جلدیں تو ہم اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں نا؟''

''ٹھیک ہے۔ ایک تو لے ہی لیں گے۔ اتنی جگہ تو نکل ہی آئے گی۔ ممبئی میں اگر ہمارے پاس پیسے ختم ہو گئے تو ہم یہ ٹکٹیں بیچ سکتے ہیں۔''

''ممبئی ہندستان میں ہے نا؟ میرا خیال تھا کہ ہم واپس انگلینڈ جا رہے ہیں۔''

''پہلے ہمیں ہندستان ہی جانا ہوگا۔''

اگلی صبح سونو باغیچے میں آیا تو میری طرح زخموں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے پاؤں پر تو پٹّی بندھی ہوئی تھی لیکن وہ ہمیشہ کی طرح خوش باش لگ رہا تھا شاید کھسیانی ہنسی ہنس رہا تھا۔

''ہم کل جا رہے ہیں۔'' میں نے اسے بتایا۔ اس کے چہرے سے ہنسی غائب ہو گئی۔

''تمھارے جانے پر مجھے دکھ ہوگا۔'' وہ بولا۔ ''لیکن ایک بات کی خوشی بھی ہوگی کہ تم جاپانیوں سے بچ جاؤ گے۔''

''جنگ ختم ہونے پر میں لوٹ آؤں گا۔''

''ضرور۔ تب تک ہم بڑے ہو جائیں گے اور دنیا گھومنے چلیں گے۔ میں انگلینڈ، امریکہ، افریقہ، ہندوستان اور جاپان کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ میں ہر جگہ جانا چاہتا ہوں۔''

''مگر ہم سب جگہ تو نہیں جا سکتے۔''

''کیوں نہیں جا سکتے، کون روکے گا ہمیں۔''

صبح ہمیں جلدی اٹھنا ہوگا۔ رات دیر تک سامان باندھتے رہے۔ ہم نے بس کچھ کپڑے، ابّا کے کام کے کاغذ، دوربین، ایک جلد ٹکٹوں کی اور بہت ساری چاکلیٹ لے لی ہیں۔ ٹکٹوں کی جلد اور چاکلیٹ رکھ کر میں بہت خوش تھا۔ مگر کئی پسندیدہ چیزیں جیسے کتابیں، گراموفون اور رکارڈ، ایک تلوار، ریل گاڑی اور نشانہ باندھنے والا بورڈ تو چھوڑنے ہی پڑے۔ تسلّی اِس بات کی ہے کہ کسی اجنبی کے پاس نہیں بلکہ سونو کے پاس ہماری یہ چیزیں رہیں گی۔ صبح ہوتے ہی ایک ٹرک گھر کے سامنے آ کر رُکا جسے مسٹر ہاکنز کا ایک ولندیزی تاجر جو اُن کے ساتھ کام کرتا تھا چلا رہا تھا۔ سونو ہمیں الوداع کہنے کے لیے گیٹ پر کھڑا تھا۔

''میں تمھیں ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں۔'' وہ بولا۔

اُس نے میرے ہاتھ پر ایک سخت سی چیز رکھ کر ہاتھ دبایا۔ میں نے روشنی میں دیکھا تو وہ نیلے پتھر کا بنا ہوا دریائی گھوڑا تھا۔

''اس سے تمھاری قسمت جاگ جائے گی۔'' سونو بولا۔

''شکریہ۔'' میں نے کہا۔ ''میں ہمیشہ اسے اپنے پاس رکھوں گا۔'' اور میں نے اسے اپنی جیب میں ڈال لیا۔

''آ جاؤ بیٹے۔'' ابّا کہہ رہے تھے اور میں مسٹر ہاکنز اور ابّا کے بیچ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ٹرک چلا تو میں نے سونو کو ہاتھ ہلا کر الوداع کہا۔ وہ باغیچے کی دیوار پر بیٹھا مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہ بولا، ''ہم سب جگہ جائیں گے اور کوئی ہمیں روکے گا نہیں۔''

ٹرک کے سڑک کا موڑ مڑنے تک سونو ہاتھ ہلاتا رہا۔

ٹرک بٹاویا کی سنسان اور پرسکون گلیوں میں سے گزر رہا تھا۔ کہیں کہیں جلے ہوئے ٹرک اور ٹوٹی ہوئی بلڈنگیں دکھائی دے رہی تھیں۔ شہرِ خموشاں ہم نے پیچھے چھوڑ دیا تھا اور ہم جنگلوں سے بھری پہاڑیوں پر چڑھ رہے تھے۔ رات بھر بارش ہوتی رہی تھی اور صبح جب ہری بھری پہاڑیوں پر سورج کی کرنیں پڑیں تو بڑے بڑے گیلے پتّے چمک اُٹھے تھے۔ جنگل میں روشنی گہرے ہرے رنگ کی سرخی مائل اور نارنجی رنگ کی ہو گئی تھی۔ ہمیں ان خوبصورت پیڑوں کے نام معلوم نہیں تھے۔ سڑک گرم خطّے کے گھنے جنگل میں سے گزر رہی تھی اور دونوں طرف کے پیڑ سورج کو دیکھنے کے لیے ٹکرا رہے تھے۔ لیکن جنگلی بیلوں نے اُن کو بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ کہیں کہیں جیلی رنگ والی جاوا کی ایک بڑی گلہری ٹرک کی آواز سے گھبرا کر درختوں پر اُچھلتی کودتی ہوئی گھنے جنگلوں میں گم ہو جاتی تھی۔ ہمیں بہت سے مور، جنگلی مرغ اور دوسرے پرند چر ند سڑک کے نزدیک شان و شوکت سے چلتے پھرتے دکھائی دیے۔ ان میں کلغی دار بڑا کبوتر بھی تھا جو دور سے ہی بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔ مسٹر ہاکنز نے ٹرک آہستہ کر دیا تا کہ ہم اس کبوتر کو اچھی طرح سے دیکھ سکیں۔ وہ اپنا سر اِس طرح جھکاتا تھا کہ اس کی کلغی زمین کو چھو جاتی تھی۔ وہ فیل مربع کی طرح ہلکی سی کھوکھلی آواز بھی نکالتا تھا۔

کھلی اور صاف سی جگہ پر پہنچ کر ہم ناشتے کے لیے رُکے۔ یہاں کالی ہری اور سنہری رنگ کی تتلیاں منڈلا رہی تھیں یا طیارے تھے جو بٹاویا پر مزید حملوں کے لیے اُڑ رہے تھے اور جنگل کی خاموشی کو توڑ رہے تھے۔ میرا دھیان سونو کی طرف چلا گیا۔ میں سوچنے لگا کہ وہ اِس وقت گھر پر کیا کر رہا ہوگا۔ شاید گراموفون کارڈ سن رہا ہوگا۔

ہم نے اُبلے ہوئے انڈے نوش کیے۔ تھرمس سے چائے نکال کر پی اور ٹرک میں لوٹ کر اپنا سفر جاری رکھا۔

میں شاید سو گیا تھا کیونکہ جہاں تک مجھے یاد ہے ہم تیزی سے پہاڑی کی بل کھائی ڈھلان دار سڑک سے اتر رہے تھے اور کچھ فاصلے پر نیلے پانی کی جھیل دکھائی دے رہی تھی۔

''ہم پھر سمندر کے پاس آ گئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔'' ابّا بولے۔ ''مگر ہم بٹاویا سے سو میل دور جزیرے کے دوسرے کنارے پر نکل آئے ہیں۔ وہ دیکھو سامنے سُنڈا آبنائے ہے۔''

ابّا جھیل کے پانی کی سطح پر ٹھہری ایک چمکدار اور سفید چیز کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

''وہ رہا ہمارا جہاز!'' ابّا نے کہا۔

''بحری ہوائی جہاز۔'' میں چلّایا، ''میں نے تو دھیان ہی نہیں دیا تھا۔''

''یہ جہاز ہمیں کہاں لے جائے گا؟''

''شاید ممبئی۔ اور کہیں جانے کی جگہ بھی تو نہیں۔''

یہ ایک پرانا سمندری طیارہ تھا اور کوئی، نا ہی جہاز کا کپتان، پائلٹ کو کپتان کہتے تھے، یہ یقین دلا سکتا تھا کہ وہ کب چل پڑے گا۔ مسٹر ہاکنز ہمارے ساتھ نہیں چل رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ جہاز اس کو لینے کے لیے اگلے روز واپس آ جائے گا۔ ابّا اور میرے علاوہ جہاز پر چار آدمی اور سوار ہوئے تھے۔ ایک کو چھوڑ کر باقی سب ولندیزی تھے۔ وہ اکیلا آدمی لندن کا رہنے والا موٹر میکینک تھا جو فوج کو چھوڑ کر جاوا میں ہی رہ رہا تھا (بعد میں اس نے ہمیں بتایا کہ وہ چینیوں کے ایک شراب خانے میں سو گیا تھا اور جب جاگا تو

اس کی رجمنٹ جا چکی تھی)۔ اس کی گردن گٹھی ہوئی تھی اور اس کی قمیض کا اوپر کا بٹن ٹوٹا ہوا تھا۔ ہماری طرح اس نے کالر کھلا نہیں چھوڑا ہوا تھا بلکہ ایک بڑا سا سیفٹی پن لگا رکھا تھا، جو اُس کی چمکدار ٹائی سے باہر نکلا ہوا تھا۔

''آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے بڑی تسلی ہو رہی ہے حضور۔'' ابا سے ہاتھ ملاتے ہوئے وہ بولا۔ ''آپ کو دیکھتے ہی میں پہچان گیا کہ آپ بھی یارک شیر مین کے ہیں۔ یہ واقعی بڑے اطمینان کی بات ہے۔ آپ میری بات سمجھ سکتے ہیں نا۔ میں تو خود کو ان بے ادب غیر ملکیوں میں گھرا پا رہا تھا۔ ان کا ایک لفظ بھی میرے پلّے نہیں پڑ رہا تھا۔ کیا خیال ہے آپ کا یہ پرانا کھٹارا ہمیں بلائٹی پہنچا دے گا۔''

''ہے تو کمزور۔'' ابّا نے کہا۔ ''دیکھنے میں تو بڑا پرانا لگتا ہے۔ زمانہ قدیم کا۔ ممبئی تک ہی لے جائے تو غنیمت ہے۔''

''جاوا سے باہر کہیں بھی لے جائے بس۔'' وہ بولا۔ ''میرا نام مگرج ہے۔''

''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی مگرج صاحب۔'' ابّا نے کہا۔ ''میں بانڈ ہوں اور یہ میرا بیٹا۔'' مگرج نے میرے بالوں کو بگاڑتے ہوئے مجھے آنکھ ماری۔

جہاز کا کپتان اپنی چھوٹی ڈونگی پر ہمیں بلا رہا تھا، جو ہمیں بحری طیارے تک لے جانے کے لیے کھڑی تھی۔

''لو، اب ہم چلے۔'' مگرج نے کہا۔ ''دُعا وغیرہ کر لو اور سنبھل کر بیٹھو۔''

طیارہ کافی دیر سے انتظار کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اُڑان لینے سے پہلے اس نے چکر لگائے، پھر جھومتا ہوا صاف نیلے آسمان میں اُڑ گیا۔

''لمحہ بھر کے لیے ایسا لگا تھا کہ ہم سمندر میں گر پڑیں گے۔'' مگرج کہہ رہا تھا۔

مچھلیوں کی بات چلی تو بولا، ''ایک پلیٹ مچھلی، کچھ چپس اور تھوڑی پنیر مل جائے تو میں اپنی ہفتہ بھر کی تنخواہ دے دوں گا۔''

''ممبئی پہنچ کر میں تمھیں بیئر لے دوں گا۔ ابّا نے کہا۔

''انڈا لیں گے۔'' مجھے یاد آیا کہ بیگ میں ابھی کچھ انڈے پڑے تھے۔

''شکریہ دوست۔'' مگرج پھرتی سے انڈے لیتے ہوئے بولا۔ ''اصلی انڈا! واہ پچھلے چھ ماہ سے تو میں انڈے کے پاؤڈر پر ہی گزارا کر رہا تھا۔ فوج میں ہی یہ سب کچھ ملتا ہے اور یہ پاؤڈر بھی مرغی کے انڈے کا نہیں ہوتا۔ شاید مرغابی کے اور کچھوے کے انڈے سے بنتا ہے۔''

''نہیں سانپ کے انڈے سے۔'' ابّا نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

مگرج کا چہرہ پیلا پڑ گیا لیکن جلد ہی سنبھل گیا اور گھنٹہ بھر باتیں کرتا رہا۔ چرچل، ہٹلر، روز ویلٹس، مہاتما گاندھی اور بیٹی گریبل (جو اپنی خوبصورت ٹانگوں کی وجہ سے مشہور تھی) کے بارے میں۔ اسے اگر موقع ملتا تو ممبئی تک بتیاتے ہی جاتا لیکن اچانک یہ پرانا طیارہ جھولنے لگا اور دوبارہ ایک سمت کو جھک گیا۔

''میرا خیال ہے انجن میں خرابی پیدا ہو گئی ہے۔'' ابّا نے کہا۔

میں نے شیشے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو ایسا لگا کہ سمندر ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔

پائلٹ کا دوسرا ساتھی سواریوں کے کیبن میں داخل ہوا اور ولندیزی زبان میں کچھ کہا۔ سواریاں گھبرا کر اپنی پیٹیاں باندھنے لگی تھیں۔

''کیا کہہ رہا تھا یہ پائلٹ؟'' مگرج نے پوچھا۔

''شاید وہ طیارے کو کھائی میں اتارنا چاہتے ہیں۔'' ابّا تھوڑی بہت ڈچ زبان سمجھتے تھے۔

''سیدھا پانی میں؟'' مگرج چلّایا۔ ''خدا بچائے! ممبئی سے ہم بھلا کتنی دور ہوں گے؟''

''یہی کوئی سو میل۔'' ابّا نے کہا۔

''تمھیں تیرنا آتا ہے دوست؟'' مگرج نے مجھ سے پوچھا۔

''ہاں، لیکن میں ممبئی تک نہیں تیر پاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کتنی دور تک تیر سکتے ہیں؟''

''میں تو نہانے کے ٹب میں ڈبکی لگاتا ہوں۔''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ دھیان رہے کہ تمھاری بچاؤ صدری ٹھیک سے بندھی ہونی چاہیے۔'' ابّا نے کہا۔

ہم نے اپنی بچاؤ صدری کا معائنہ کیا۔ ابّا نے دوبار میری بچاؤ صدری کو دیکھا یہ جاننے کے لیے کہ ٹھیک سے بندھی ہوئی ہے یا نہیں۔

پائلٹ نے دونوں انجن بند کر دیے تھے اور طیارے کو چکر لگوا رہا تھا۔ لیکن وہ طیارے کی رفتار پر قابو نہیں پا رہا تھا۔ طیارہ ایک طرف کو جھکتا جا رہا تھا اور اپنے نچلے حصّے کے بل روانی سے اُترنے کے بجائے اپنے پنکھے کی نوک کے بل زور سے طوفانی سمندر پر گھوم گیا۔ طیارے کے پانی پر گرتے ہی زبردست جھٹکا لگا۔ اگر ہم نے بچاؤ پیٹی نہ باندھی ہوتی تو ہم اپنی سیٹوں سے اچھل کر گر پڑتے۔ پھر بھی مگرج کا سر اگلی سیٹ سے جا ٹکرایا اور اُس کی ناک سے خون بہنے لگا۔ وہ برا بھلا کہہ رہا تھا۔

طیارہ رُکتے ہی ابّا نے میری بچاؤ پیٹی کھول دی۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ پانی کیبن میں گھس آیا تھا۔ ایک مسافر کو چھوڑ کر جو اپنی سیٹ پر گردن کے ٹوٹنے کی وجہ سے مرا پڑا تھا، باقی سب باہر نکلنے کے دروازے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ دوسرے پائلٹ نے ایک لیور کو کھینچا اور دروازہ ایک دم کھل گیا۔ پانی کی لہریں دھنسے ہوئے طیارے سے ٹکرا رہی تھیں۔

ابّا میرا ہاتھ تھامے باہر نکلنے کے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''جلدی کرو بچے! ہم زیادہ دیر تک پانی پر رکے نہیں رہ سکتے۔'' ابّا نے کہا۔

''ارے بھئی میرا ہاتھ بھی پکڑ لو۔'' مگرج چلایا۔ اُس کی بچاؤ صدری اٹک گئی تھی۔

''ایک تو ناک سے خون بہہ رہا ہے اور اب یہ کیا اَڑ گیا ہے۔''

ابّا نے اُس کی بچاؤ صدری چھڑائی اور باہر نکلنے میں اُس کی مدد کی۔ ہم بحری جہاز سے نکل کر تیر رہے تھے۔ (مگرج بھی ہمارے ساتھ پانی میں چھپ چھپ کر رہا تھا) مگر دوسرے مسافر پانی میں اٹکے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ڈچ زبان میں اپنے پیچھے آنے کو کہہ رہا تھا۔

ہم ایک ڈونگی کی طرف تیز تیز جا رہے تھے۔ طیارے کے پانی کو چھوتے ہی ڈونگی کو کھول دیا گیا تھا۔ پہلی ڈونگی پانی کی لہروں میں اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ وہ ہمیں زمین کی طرح لگ رہی تھی۔

لوگ طیارے سے باہر آنے کے بعد ڈونگی میں سوار ہو رہے تھے۔ ہم سات لوگوں کے لیے جگہ تنگ تھی۔

ہم ابھی ڈونگی کے عرشے پر تھے کہ مگرج اپنی ناک کو پکڑے ہوئے بولا، ''لو، وہ چل پڑا۔'' ہم نے بے کسی کی حالت میں بحری طیارے کو لہروں میں ڈوبتے ہوئے دیکھا۔

ڈونگی میں بہت پانی بھر گیا تھا۔ سبھی لوگ مگّے بھر بھر کر پانی نکال رہے تھے۔ (ڈونگی میں مگوں کی کمی نہیں تھی) کچھ لوگ اپنے ہیٹ اور ہاتھوں کا استعمال بھی کر رہے تھے لیکن پانی کے اُتار چڑھاؤ سے بیچ بیچ میں پانی ڈونگی میں بھر جاتا تھا۔ آدھے گھنٹے میں ہم بہت سارا پانی نکالنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ دو دو آدمی باری باری ڈونگی کھینچتے جبکہ باقی آرام کرتے۔ مجھ سے مدد کی کوئی امید نہیں کر سکتا تھا تاہم میں بھی اپنے ابّا کے سولو ہیٹ سے پانی نکال رہا تھا۔

''ہم کہاں پر ہیں اب؟'' میں نے دوسرے مسافروں سے پوچھا۔

''منزل ابھی دور ہے۔'' ایک بولا۔

''بحر ہند میں کئی جزیرے ہوں گے۔''

''مگر کسی جزیرے تک پہنچنے سے پہلے کئی دن ہمیں سمندر پر ہی گزارنے ہوں گے۔''

''دن ہی کیوں، کئی ہفتے۔'' کپتان بولا۔

''ہمارے پاس رسد کتنی ہوگی؟''

''ڈونگی میں فوری ضرورت کے لیے کافی رسد کا انتظام ہوتا ہے۔ بسکٹ، کشمش، چاکلیٹ وغیرہ ہفتہ بھر کے لیے کافی تھا۔ (ہمارا اپنا سامان تو ڈوب گیا تھا۔) فوری ادویات کا بکسا موجود تھا جو مگرج کی ناک کو راحت پہنچانے کے کام آیا۔ کچھ اور لوگوں کو بھی چوٹیں آئی تھیں۔ ایک سوار کے سر پر سخت چوٹ لگی تھی اور وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا اور بتانے

سے قاصر تھا کہ ہم بحر ہند میں کیوں کر آ گئے تھے۔ اسے لگا کہ ہم شاید بٹاویا سے میلوں دور تفریح کے لیے آئے تھے۔

لہروں پر ڈوگی کے غیر مانوس ہچکولوں کی وجہ سے کئی لوگوں کو متلی وغیرہ کی شکایت ہو رہی تھی۔ چونکہ کھانے کو کسی کا جی نہیں چاہ رہا تھا، اس لیے ایک دن کا راشن بچ گیا تھا۔

شدید گرمی کی وجہ سے ابّا نے میرے سر پر بڑا سا گلدار رومال ڈال دیا تھا۔ ابّا کو پیلی بندکیوں والے رومال بہت پسند تھے اور وہ دو چار رومال ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے۔ اُن کے خود کے لیے بھی ایک ایسا ہی رومال تھا۔ ان کا سولو ہیٹ جو بھیگ چکا تھا مگرج کے کام آ رہا تھا۔

جیسے ہی سمندری علالت سے میری طبیعت سنبھلی مجھے ٹکٹوں کے البم کی یاد آ گئی۔ میں نے اُسے پوچھا۔ ''آپ ٹکٹوں کے البم لائے تھے نا؟''

ابّا نے افسوس میں سر ہلایا۔ ''اب تک وہ سمندر کی تہہ میں پہنچ چکی ہو گی۔'' وہ بولے۔ ''تم فکر مت کرو۔ کچھ نایاب ٹکٹیں میں نے اپنے پرس میں رکھ لی تھیں۔'' اور انھوں نے قمیض کی جیب کو ٹھوکا۔

ڈونگی دن بھر چلتی رہی اور ہر ایک بے خبر تھا کہ وہ انھیں کہاں لے جا رہی تھی۔

''ابھی تک چکر ہی کاٹے جا رہی ہے۔'' مگرج نے ناامید ہو کر کہا۔

نہ تو اس پر کمپاس تھا اور نہ ہی بادبان۔ اگر ہم اسے چپوؤں سے کھینے بھی لگیں تو بے سود ہوگا۔ ہم نے لہروں کے سہارے چھوڑ دیا تھا اس امید سے کہ یہ ہمیں زمینی سطح پر لے جائے گی یا کم از کم ایسی جگہ جہاں سے ہم کسی آنے جانے والے بحری جہاز کو پکار سکتے۔

آفتاب غروب ہوتا ہوا ایک پکے ہوئے ٹماٹر کی طرح لگ رہا تھا جو دھیرے دھیرے سمندر میں غرق ہو گیا۔ رات چاندنی تھی اور ہم لہروں پر اُبھرتی جھاگ کو دیکھ سکتے تھے۔ میں ابّا کے کندھے پر سر رکھے دور آسمان میں چمکتے ستاروں کو دیکھ رہا تھا کہ ابّا نے کہا۔ ''یہ دنیا درحقیقت بہت بڑی نہیں ہے۔''

''لیکن ہمارے چاروں طرف تو سمندر ہی سمندر ہے۔'' مگرج نے اندھیرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

سونو کی یاد آئی تو میں اپنی جیب میں پتھر کے دریائی گھوڑے کو ٹٹولنے لگا۔

''سونو کا دریائی گھوڑا میرے پاس ہے۔'' ابّا کو دکھاتے ہوئے میں نے کہا۔

''سنبھال کر رکھوا سے۔ شاید اسی سے ہماری قسمت بدل جائے۔'' ابّا نے کہا۔

''دریائی گھوڑے کیا قسمت والے ہوتے ہیں؟''

''اُس نے تمھیں بڑے پیار سے دیا تھا اور پیار میں دعائیں چھپی ہوتی ہیں۔ اس لیے اسے سنبھال کر رکھنا۔''

اُس رات میں ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ شاید کوئی بھی ٹھیک طرح سے سو نہیں پایا تھا۔ مگرج کے علاوہ کوئی بول بھی نہیں رہا تھا۔ وہ بھی بس ٹھنڈی بیئر اور سلامی کی رٹ لگائے ہوئے تھے۔

اگلے روز میری طبیعت ٹھیک تھی۔ دس بجے کے قریب مجھے شدید بھوک محسوس ہوئی مگر ناشتے میں فقط دو بسکٹ، ایک ٹکڑا چاکلیٹ اور پینے کے لیے تھوڑا پانی ہی ملا۔ سخت گرمی تھی اور ہمیں پیاس لگی تھی۔ لیکن ہر ایک ضبط رکھنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

دو یا تین مسافر ابھی بھی بیماری کی علامت ظاہر کر رہے تھے۔ لیکن مگرج اور دوسرے مسافروں کا ہاضمہ درست تھا اور وہ ڈونگی سے کھانے کا سامان اٹھائے جانے کے امکانات پر بحث کر رہے تھے۔

''ڈونگی میں کوئی بندوق یا ہوائی راکٹ نہیں ہے چھوڑنے کے لیے؟'' ابّا نے پوچھا۔

''ممکن ہے کوئی بحری جہاز دکھائی دے جائے تو ہم ہوائی وغیرہ چھوڑ سکتے ہیں تاکہ وہ لوگ ہمیں ڈھونڈ سکیں۔ ورنہ اتنے فاصلے سے کسی کے ہمیں دیکھنے کی کوئی امید نہیں۔''

ڈونگی کی اچھی طرح سے تلاشی لی گئی لیکن ہوائی راکٹ وغیرہ نہ ملا۔ ''کسی نے گائی فاکس کے دن استعمال کر لیا ہوگا۔'' مگرج نے اظہارِ خیال کیا۔

''لیکن ہالینڈ میں گائی فاکس دن تو نہیں منایا جاتا۔'' ابّا نے کہا۔ ''گائی فاکس ایک

انگریز تھا۔''

''اوہ میں یہی کہا کرتا ہوں کہ اکثر عظیم آدمی انگریز ہی ہوتے ہیں۔ گائی فاکس نے کیا معرکہ کیا تھا بھلا؟''

''اس نے پارلیمنٹ کو اُڑا دینے کی کوشش کی تھی۔'' ابّا نے کہا۔

اس دوپہر ہم نے پہلی بار مگرمچھ دیکھے جو بہت بڑے بڑے تھے۔ جیسے ہی ڈونگی کے نیچے آگے پیچھے بھاگتے، لگتا تھا وہ ہم پر حملہ کر کے کشتی کو الٹ دیں گے۔ کچھ دیر کے لیے یہ مگرمچھ غائب ہو گئے لیکن شام کو پھر نمودار ہوئے۔

رات کو میں ابا کی بغل میں سو رہا تھا کہ میرے منہ پر پانی کے کچھ چھینٹے پڑے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ سمندری پھوار ہے۔ لیکن جب چھینٹے نہیں رُکے تو میں نے جانا کہ بارش ہو رہی تھی۔

''بارش!'' میں چلایا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پانی برس رہا ہے۔ سب جاگ گئے تھے اور مگوں اور ڈبّوں میں پانی اکٹھا کر رہے تھے۔ مگرج نے تو اپنا منہ ہی کھول دیا تھا۔

''واہ! خوب! مجھ سے دنیا کی ہر چیز لے لو مگر انگلینڈ میں یہ بارش دے دو۔'' مگرج کہہ رہا تھا۔

صبح ہوتے ہوتے بادل چھٹ چکے تھے اور گرمی پہلے دن سے بھی زیادہ تھی۔ دھوپ سے ہم سب کے چہرے سرخ ہو گئے تھے۔ دوپہر تک مگرج بالکل خاموش ہو گیا تھا اور کسی میں بھی بات کرنے کی طاقت نہیں تھی۔

اُس وقت ابّا نے پوچھا۔ ''تمھیں کسی ہوائی جہاز کی آواز سنائی دے رہی ہے بیٹا؟''

میں نے غور سے سننے کی کوشش کی اور لہروں کی سرسراہٹ کے ساتھ کسی طیارے کی آواز بھی سنائی دی۔ مگر آواز بہت دور سے آ رہی تھی کیونکہ طیارہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید بہت اونچا اُڑ رہا تھا اور سورج کی روشنی میں ہماری آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ہم صرف آواز کا تصور ہی کر رہے ہوں۔ اس ولندیزی نے جو اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا، سوچا شاید اس نے زمین دیکھی ہے۔ وہ اُفق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''وہ رہا

بڑھا دیا۔ میں نے کہا تھا نا کہ ہم ساحل کے قریب ہیں۔'' اور کسی کو کہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

صرف ابّا اور میں خیال کے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔

''اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدمی جو دیکھنا چاہے دیکھ سکتا ہے چاہے دیکھنے کے لیے کچھ بھی نہ ہو۔'' ابّا نے کہا۔

مگرمچھ اب بھی ہمارے اِردگرد گھوم رہے تھے۔ مگرج آزردہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا جوتا نکال کر مگرمچھ پر پھینکا۔ مگرمچھ جوتے کی پرواہ کیے بغیر ہمارے پیچھے تیرتا رہا۔

''مگرج، اگر تمھاری ٹانگ جوتے میں ہوتی تو مگرمچھ یقیناً اس پر جھپٹ پڑتا۔'' ابّا نے اظہارِ رائے کیا۔

''جوتے مت پھینکئے۔'' کپتان بولا۔ ''ہم ویران ساحل پر پہنچ گئے تو میلوں پیدل چلنا پڑ سکتا ہے۔''

شام کے وقت ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی تھی اور ڈوگی سمندر پر تیز تیز بھاگنے لگی تھی۔

''آخر ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔'' کپتان نے کہا۔

''چکر کاٹتے ہوئے۔'' مگرج بولا۔

ہوا بڑی خوشگوار تھی۔ اس سے ہمارے بھیگے جسموں کو ٹھنڈک ملی اور ہم تھوڑا سو سکے۔

آدھی رات کے وقت بھوک کی وجہ سے میری نیند کھل گئی۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' ابّا نے جو سارا وقت جاگتے رہے تھے پوچھا۔

''بھوک لگی ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا کھاؤ گے؟''

''سنگترے۔۔۔!''

''یہاں ڈونگی میں سنگترے کہاں!'' ابّا ہنسے۔ ''تمھارے لیے اپنے حصہ کی چاکلیٹ میں نے سنبھال رکھی ہے۔ پیاس بجھانی ہو تو تھوڑا پانی بھی ہے۔''

چاکلیٹ میں نے منہ میں کافی دیر تک رکھی تاکہ جلدی گھل نہ جائے اور تھوڑا پانی

پی لیا۔

''آپ کو بھوک نہیں لگی کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت، اتنی کہ پورا فیل مرغ کھا جاؤں۔ ممبئی، مدراس یا کولمبو یا کسی اور جگہ پہنچ کر ہم بڑھیا ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر ایسے کھائیں گے۔۔۔ ایسے کھائیں گے۔۔۔''

''کسی پامال شدہ جہاز کے ملاح کی طرح'' میں نے کہا۔

''بالکل۔''

''آپ کا خیال ہے ہم زمین پر پہنچ جائیں گے؟''

''یقیناً۔ تمھیں ڈر لگ رہا ہے کیا؟''

''نہیں تو۔ جب تک آپ میرے ساتھ ہیں ڈر کی کیا بات ہے۔''

اگلی صبح سمندری بگلوں کے دکھائی دینے پر سب لوگ خوش ہو گئے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ہم زمین کے نزدیک تھے لیکن تیس چالیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے لیے ڈونگی کو کئی دن لگ سکتے تھے۔ بگلے ڈونگی کے اردگرد شور مچاتے چکر لگا رہے تھے۔ تین دن اور تین راتوں میں ہوا کی سرسراہٹ کے علاوہ پہلی بار ہم نے کچھ آوازیں سنی تھیں۔

مگرمچھ غائب ہو گئے تھے۔ یہ بھی ایک تسلّی کی بات تھی۔ ان کو پانی میں اُبھر رہے تیل کی دھاریاں اچھی نہیں لگتیں۔ جلدی ہی بگلے بھی غائب ہو گئے۔ ہم خوف زدہ ہو گئے کہ ہم زمین سے دور ہو گئے تھے۔

''چکر۔۔۔ مگر'' ج بولا ''چکر؟''

ہمارے پاس ہفتے بھر کے لیے رسد اور پانی تھا لیکن کوئی بھی ایک اور ہفتہ سمندر پر گزارنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ آسمان شعلہ بار ہو رہا تھا۔ ہمارے پاس اتنا پانی نہیں تھا جو ہماری پیاس بجھا سکتا۔ دوپہر تک ہم نا اُمید ہو گئے تھے۔ ہماری طاقت سلب کی سی ہو گئی تھی۔

ابّا منہ میں اپنی پائپ لگائے ہوئے تھے۔ ان کے پاس تمباکو نہیں تھا لیکن دانتوں میں پائپ دبائے رکھنا انھیں اچھا لگ رہا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح ان کا منہ خشک

نہیں ہوگا۔

مگر مچھ پھر سے دکھائی دینے لگے تھے۔مگرج نے اپنا دوسرا جوتا بھی نکال کر ان پر پھینک مارا۔

''گرمیوں میں انگلینڈ کی بارش کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔ میں ڈونگی کے عرشے پر ہی منہ پر ابا کا رومال ڈال کر سو گیا۔رومال کے پیلے دھبے گھومتے ہوئے بڑے بڑے سورج لگ رہے تھے۔

میری نیند کھلی تو بڑے بڑے سائے دکھائی دیے۔ پہلے تو یہ سائے بادلوں جیسے لگے لیکن یہ سائے بدلتے رہے۔ابّا نے میرے منہ پر سے رومال ہٹا دیا اور بولے،''اُٹھو بیٹا ہم جلد ہی گھر پہنچنے والے ہیں۔''

مچھلیاں پکڑنے والی ایک کشتی ہمارے نزدیک کھڑی تھی۔وہ سائے اس کے بڑے سے بادبان کے تھے۔تانبے کے رنگ کے کئی مسکراتے، باتیں کرتے مچھوارے جو برما کے لوگ تھے،اپنی کشتی سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

کچھ دن بعد میں اور ابا ممبئی میں تھے۔

ابّا نے اپنی نایاب ٹکٹیں ایک ہزار روپے میں بیچ دیں اور ہم ایک آرام دہ ہوٹل میں رہنے والے بنے۔مگرج انگلینڈ چلا گیا تھا۔بعد میں اس کا ایک کارڈ ملا۔لکھا تھا:''انگلینڈ کی بارش بڑی مؤثر ہے۔''

''ہم۔۔۔ہم انگلینڈ نہیں جا رہے؟''میں نے پوچھا۔

''ابھی نہیں۔ جب تک جنگ ختم نہیں ہو جاتی۔تم شملہ میں بورڈنگ اسکول میں رہو گے۔''ابّا نے کہا۔

''آپ کو چھوڑ کر؟''میں نے پوچھا۔

''کیونکہ میں آر۔اے۔ایف میں شامل ہو گیا ہوں اور مجھے دہلی جانا ہے۔تم فکر مت کرو۔میں کبھی کبھار تم سے ملنے آیا کروں گا۔''

ایک ہفتے کے بعد میں ایک چھوٹی سی گاڑی میں سفر کر رہا تھا جو شملہ کی پہاڑیوں پر

رینگ رینگ کر چل رہی تھی۔ بہت سے ہندستانی، اینگلو انڈین اور انگریز بچے ڈبے میں موجود تھے مگر میں اُن کے بیچ خود کو اکیلا محسوس کر رہا تھا، حالانکہ میں ایسی وادیوں کے بیچ میں پلا بڑھا تھا۔لیکن میں خوش تھا اور میں جانتا تھا مجھ سے جلد ہی ملنے آئیں گے۔ابّا نے پہلی تنخواہ ملتے ہی مجھے بہت سی کتابیں، رولر سکیٹ، کرکٹ کا بلّا لے کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔

میرے پاس سونو کا دیا ہوا پتھر کا دریائی گھوڑا تو تھا ہی اور آج بھی وہ میرے پاس ہے۔

●●●

کبڑا بھکاری

ایک بوڑھا آدمی جو اکثر مجھ سے سڑک پر ٹکراتا تھا وہ کمر جھکا ہوا فقیر گنپت تھا۔ روزانہ صبح کے وقت لنگڑاتا ہوا میرے کمرے کے پاس سے سڑک پر جاتا ہوا دکھائی دیتا اور اچانک راہ گیروں اور دکانداروں کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا۔ گنپت کو روکنا بہت مشکل تھا۔ اس کا چہرہ وجیہہ، آنکھیں بارعب اور لمبی سفید داڑھی تھی اور آواز میں بہت جان تھی۔ شاید اسی لیے لوگ اس کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ کبھی اداکار رہا ہوگا۔

اس کے بارے میں اور بھی بہت باتیں مشہور تھیں۔ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ وہ کبھی اچھا وکیل تھا اور اس کی ولایتی بیوی تھی۔ ایک حادثہ کی وجہ سے اس کا مستقبل تباہ ہو گیا اور نتیجہ کے طور پر اس کی بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کے بارے میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ سی۔آئی۔ڈی۔ میں ہے اور بھیس بدل کر گھومتا رہتا ہے۔ یہ افواہ خود گنپت ہی نے پھیلائی تھی۔

اس کے بارے میں صحیح بات جاننے کے میرے دل میں خواہش تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی مرضی سے فقیر بنا تھا، کیوں کہ اس کے مانگنے کا انداز اپنے ہم پیشہ لوگوں سے الگ تھا۔ اس کی انگریزی بھی اچھی تھی اور وہ شیکسپیئر کے کچھ بند سنایا کرتا تھا۔ وہ کبھی بھی براہِ راست بھیک نہیں مانگتا تھا بلکہ وہ لوگوں سے انسانی فطرت کی برائیوں پر گفتگو شروع کر دیتا اور اس وقت تک گفتگو کرتا جب تک کہ اسے ایک سکہ نہ مل جاتا۔

میں نے ایک دن اس سے کہا: ''دیکھو گنپت میں نے تمھارے بارے میں بہت سی باتیں سنی ہیں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ سچائی کیا ہے۔ تم بھکاری کیوں بنے؟ اور تمھاری کمر کیسے جھک گئی؟''

بھکاری نے اپنے بارے میں میری دلچسپی کو دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے کہا: ''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ تم میری بات پر یقین کرو گے کیوں کہ میں یہ باتیں ہر کس و ناکس کو بتا بھی نہیں سکتا۔''

میں نے اس سے کہا کہ میں اس کہانی کے بتانے کا اسے ایک روپیہ دوں گا۔ اس سے اس کی خواہش کی تکمیل ہوتی تھی۔

اس نے اپنی ڈاڑھی کو جنبش دی اور میری بات پر غور کرتے ہوئے کہا: ''ٹھیک ہے۔'' وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا اور میں کود کر ایک چبوترے پر جا بیٹھا۔ بھکاری نے اپنی کہانی سنانی شروع کی: ''تفصیل کے ساتھ تو میں نہیں بتا سکتا کیوں کہ اس واقعہ کو تقریباً بیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔''

گنپت نے بتایا: ''ان دنوں میں جوان تھا۔ میری بیوی اور ایک بیٹی تھی۔ میرے پاس چند ایکڑ زمین تھی اور میں ایک اوسط درجے کا آدمی تھا۔ میرے گاؤں سے بازار پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ میں اپنی فصل بیچنے کے لیے بازار لے کر جاتا تھا اور میں بیل گاڑی پر سوار بیلوں کو ہانکتا ہوا جب گاؤں کی گرد آلود سڑک پر اترتا تو رات میں اکثر دیر ہو جاتی تھی۔

''روزانہ رات کو میں پیپل کے پیڑ سے ہو کر گزرتا تھا جس کے بارے میں سنا تھا کہ اس پر بھوت پریت رہتے ہیں۔ میں نے کبھی بھوت نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی مجھے ان پر یقین تھا لیکن مجھے اس بھوت جس کا نام پپن تھا کے بارے میں اتنا معلوم تھا کہ ڈاکوؤں نے پپن کو پیپل کے پیڑ پر لٹکا کر مار ڈالا تھا، تب سے بھوت کی شکل میں وہ اسی پیڑ پر رہتا تھا۔ ڈاکو کی شکل کا کوئی بھی آدمی اسے دکھائی دیتا تو وہ اس پر جھپٹتا اور اسے بری طرح پیٹتا تھا۔ پپن نے مجھ پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا، کیوں کہ میں اپنے کاروبار میں کامیاب ہو کر

گھر واپس آ رہا تھا۔ اس نے پیڑ سے چھلانگ لگائی اور سڑک کے بیچ آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنی بیل گاڑی کو روک لیا۔

اس نے چلا کر کہا: ''اچھا تو تم ہو۔ گاڑی سے نیچے اتر جاؤ۔ پہلے میں ڈنڈے سے تمھارے پٹائی کروں گا اور پھر رسّی سے باندھ کر پیڑ پر لٹکا دوں گا!''

یہ سن کر میں چوکنا ہو گیا اور میں نے سوچ لیا کہ اس کا مقابلہ کروں گا۔ میں گاڑی سے نیچے نہیں اترا اور اس سے کہا کہ اگر تم آنا چاہتے ہو تو گاڑی پر چڑھ آؤ۔ پن آدمی کی طرح بات کر رہا تھا۔ اس نے چھلانگ لگائی اور گاڑی پر میرے پاس آ بیٹھا۔

میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا کہ میں ڈاکو نہیں ہوں۔ نہ تم ڈاکو کی طرح لگتے ہو۔ میں تو ایک غریب آدمی ہوں۔ میری بیوی اور ایک بچہ ہے۔

پن نے کہا کہ تم غریب آدمی تو نہیں لگتے۔

''اگر تم مجھے امیر بنا سکتے ہو تو بنا دو۔''

''کیا تمھیں یقین ہے کہ میں تمھیں امیر بنا سکتا ہوں؟''

''مجھے پورا یقین ہے کہ تم مجھے مالدار بنا سکتے ہو۔''

''چلو!'' پن نے کہا ''میں تمھارے گھر چل رہا ہوں۔''

اور میں پن کو گاڑی پر ساتھ بٹھائے ہوئے گاؤں پہنچ گیا۔ اس نے کہا کہ مجھے کوئی نہیں دیکھ پائے گا اور میں روز رات کو تمھارے ساتھ سویا کروں گا۔ یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تم نے کسی کو بتایا تو میں تمھارا گلا گھونٹ دوں گا۔

میں نے اسے یقین دلایا کہ میں یہ بات کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ میں پیپل کے پیڑ کے نیچے اکیلا سو جاتا۔ رات کو پن میرے پاس آ کر لیٹ جاتا اور ہم دونوں اس طرح رہتے رہے۔ وہ اپنے وعدے پر قائم رہا۔ میرے پاس پیسے آنے شروع ہو گئے اور اتنے پیسے آ گئے کہ میں نے بہت سی زمین اور مویشی خرید لیے لیکن اس راز کا کسی کو پتہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ میرے دوستوں اور رشتہ داروں کو حیرت تھی کہ میرے پاس اتنا پیسہ اچانک کہاں سے آ گیا۔ ادھر میری بیوی بھی کچھ مایوس تھی کہ رات میں، میں اس سے الگ

کیوں سوتا ہوں۔ اس لیے کہ میں اپنی بیوی کو ایک بھوت کے ساتھ نہیں سلا سکتا تھا۔ پن پابندی کے ساتھ میرے ساتھ سوتا تھا۔ پہلے تو میں نے اپنی بیوی سے یہ بہانا کیا کہ بیمار ہوں اس لیے ورانڈے میں سوتا ہوں۔ پھر میں نے بیوی سے کہا کہ رات کو مویشیوں کی دیکھ بھال کے لیے انھیں کے ساتھ سونا پڑتا ہے۔ لیکن حقیقت میں، مویشی خانے میں تو میں پن کے ساتھ سوتا تھا۔

میری بیوی اکثر رات کو اُٹھ کر مجھے دیکھتی کیوں کہ اسے شک ہو گیا تھا، لیکن وہ ہمیشہ مجھے تنہا پاتی تھی، وہ اس راز کو نہ سمجھ پائی۔ اس نے گھر کے دوسرے لوگوں سے اس بارے میں بتایا۔ دوسرے دن میری سسرال کے کچھ لوگ میرے گھر آ گئے اور انھوں نے گھر سے باہر مویشی خانے میں سونے کی وجہ معلوم کی۔

ادھر میرے کچھ رشتہ دار بھی بار بار یہ جاننے کے لیے زور ڈال رہے تھے کہ آخر اتنی جلدی تیری قسمت کیسے پلٹ گئی۔ چاچی چاچا، بھائی بھتیجے اور گاؤں کے دوسرے لوگ بھی یہی جاننے کے خواہش مند تھے کہ میرے پاس اتنی دولت کہاں سے آ رہی ہے اور وہ بھی اس دولت میں سے کچھ حصہ لینا چاہتے تھے۔

یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے اُن سے کہا کیا تم سب لوگ مل کر مجھے مارنا چاہتے ہو۔ میں نے خاموش رہنے کی قسم کھائی ہے۔ اگر میں نے تمھیں دولت کے آنے کا ذریعہ بتا دیا تو میرے لیے موت کا پیغام ہوگا۔

وہ لوگ میری اس کمزور تاویل پر ہنس پڑے۔ انھیں شک ہوا کہ شاید یہ ہم سے کچھ چھپا رہا ہے۔ میری بیوی کے رشتہ داروں کو اس بات کا شک ہو گیا تھا کہ کہیں میں نے دوسری عورت سے تو شادی نہیں کر لی ہے۔ ان سب کے بار بار اشتعال انگیز سوالوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں کسی کمزور لمحہ میں اپنی زبان سے سچائی اگل بیٹھا۔

لیکن انھیں میری بات پر یقین نہیں آیا (آ بھی کیسے سکتا تھا) اور وہ آپس میں اس بارے میں بات چیت کرنے لگے اور انھوں نے چند روز کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دیا۔

بس اسی رات سے پن میرے پاس سونے کے لیے نہیں آیا۔ اب میں اکیلا ہی

وہاں سوتا تھا۔ جب وہ کچھ روز تک نہیں آیا مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں وہ سوتے میں میرا گلا نہ گھونٹ دے۔ اب مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ میرا زوال شروع ہو گیا ہے۔ مجھے بس اپنے گھر میں سونا چاہیے۔

دوسرے دن جب میں بازار سے اپنے گاؤں واپس آ رہا تھا، پن پیپل کے پیڑ سے کود کر میرے سامنے گھڑا ہو گیا۔ اس نے بیل گاڑی روک دی اور چلا کر بولا: ''تم جھوٹے دوست ہو۔ میں نے تمھیں سب کچھ دیا لیکن پھر بھی تم نے میرے راز کو فاش کر دیا۔''

میں نے پن سے کہا۔ ''اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ لیکن تم انسانوں کی فطرت کو نہیں سمجھتے اگر تم چاہو تو مجھے پیپل کے پیڑ سے لٹکا کر مار سکتے ہو۔''

پن نے کہا۔ ''نہیں میں تمھیں ماروں گا تو نہیں، کیوں کہ میری تم سے بہت پرانی دوستی ہے۔ مگر تمھیں سزا ضرور دوں گا۔''

اس نے ایک ڈنڈا اٹھایا اور ایک ایک کر کے تین بار میری کمر پر مارا اور میری کمر دوہری ہو گئی۔

اس کے بعد میں کبھی سیدھا کھڑا نہیں ہو سکا۔ اس واقعہ کو بیس سال گزر چکے ہیں اور میں ایک کبڑے آدمی کی طرح زندگی گزار رہا ہوں۔ میری بیوی بھی مجھے چھوڑ کے میکے چلی گئی۔ میں کوئی کام نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنا گاؤں بھی چھوڑ دیا ہے اور ادھر اُدھر آوارہ گھومتا ہوں۔ میں اس شہر میں روزی کمانے کے لیے آیا ہوں کہ یہاں کے لوگ دوسری جگہوں کے مقابلے زیادہ سخی اور بہتر ہیں۔

اس نے میری طرف ملتجی نظروں سے دیکھا جیسے وہ وعدے کے مطابق ایک روپے کا انتظار کر رہا ہو۔ میں نے اسے ایک روپیہ دیا۔

گنپت نے روپیہ واپس کرتے ہوئے کہا ''نہیں نہیں، اگر تم میری بات پر یقین نہیں کرتے تو روپیہ واپس رکھ لو۔''

بالآخر اس نے نوٹ ہاتھ میں پکڑ لیا اور کبڑاتا ہوا بازار کی طرف چلا گیا۔ اس نے

مجھے ایک دلچسپ کہانی سنائی لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے جو کچھ بتایا وہ کہاں تک سچ تھا۔ وہ اپنی چالاکی سے روپیہ تو لے ہی گیا۔ یقیناً سی.آئی.ڈی کا آدمی ہی تھا۔

کبڑے بھکاری کی چند نصیحتیں

گنپت ایک بھوت تھا لیکن اس کا یہ تجربہ کہ عورت کسی بھی وقت اور کسی سے بھی حسد کر سکتی ہے، صحیح تھا۔

☆

کبڑے بھکاری نے کہا کہ تمھیں انسانوں سے محبت کرنا چاہیے۔

میں نے پوچھا کیا دشمنوں سے بھی؟

دشمنوں سے محبت کرنا تو مشکل کام ہے لیکن اس سے زیادہ آسان کام یہ ہے دشمن پیدا ہی نہ کیے جائیں۔

☆

میں نے ایک ایسے برہنہ انسان کو دیکھا جو دنیا ترک کر چکا تھا اور پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ ہم سے کہیں بہتر ہے کیوں کہ اس نے زندگی کی تمام خواہشات پر قابو پا لیا ہے۔ گنپت ہم اس کی طرح نہیں ہو سکتے۔

ہم اس کے بارے میں ایسا سوچتے تو ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں..... اس کے قریب پہنچ کر ہم نے اس سے کہا: ''بابا جی کیا تم ہمیں یہ آسن سکھا سکتے ہو؟''

''ہاں سکھا سکتا ہوں۔'' بابا جی نے جلدی سے جواب دیا۔ ''لیکن ہر سبق کی پندرہ روپے قیمت ادا کرنی ہو گی۔''

گنپت نے میری طرف دیکھا اور کہا: ''ہر کام کے پس پشت کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اس عبادت کے پیچھے بھی خواہش موجود ہے۔ آئندہ صلاح دینے کی میں تم سے قیمت وصول کروں گا۔''

☆

گنپت جو ایک کبڑا بھکاری تھا، اکثر کہا کرتا تھا کہ اگر دنیا کی تمام پریشانیوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے اور لوگوں سے کہا جائے کہ کسی ایک پریشانی کو چن لو تو آخری میں ہم اپنی پرانی پریشانی کو ہی چننا بہتر سمجھیں گے۔

☆

اس نے ایک عام راستہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''دیکھو یہ راستہ ایسا دکھائی دے رہا ہے جیسے یہاں سے کوئی سانپ لہراتا ہوا گزر گیا ہو۔ سانپ کے چلنے کے انداز سے راستہ بھی خوبصورت دکھائی دینے لگا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا: ''تم بھی اپنے اندر ایسی خوبیاں پیدا کرو جس سے تمھارے سوچنے اور چلنے کے اندر میں خوبصورتی پیدا ہو جائے۔''

☆

میں نے تمھیں اپنی پارٹی میں مدعو کیا۔ لیکن تم نہیں آئے مجھے شکایت ہے۔
اگر میں نہیں آیا تو کیا ہو گیا۔ تم مجھے اپنے امیر دوستوں کی پارٹی میں بلانا چاہتے تھے۔ اس تجربے نے مجھے وہ سب کچھ دے دیا جس کی مجھے ضرورت تھی۔
زندگی میں ہماری خواہشات پوری تو ہوتی ہیں لیکن وہ ہمیں خوشیاں نہیں ملتیں جن کی ہم امید کرتے ہیں۔

☆

ہندوستان میں کسی کام میں تاخیر ہونے پر مایوس نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ یہاں وقت کی کوئی قدر نہیں ہے۔

☆

ایک مشہور کہاوت ہے کہ اگر گوکھاؤ تو ہاتھی کا۔

☆

ایک کم تعلیم یافتہ آدمی کی غلطی کو تو عظیم کہا جا سکتا ہے لیکن ایک تعلیم یافتہ انسان کی غلطی کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہاں عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔

☆

جمہوری نظام کی کامیابی کے لیے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہاں کے عوام ایماندار ہوں۔

☆

نطشے غلط تھا، یہ بات نہیں ہے بلکہ خوشی یہ ہے کہ اس نے ہمارے وجود کو باندھ دیا ہے۔
ہر وقت غمگین رہنا مشکل ہے، کیوں کہ انسانی فطرت اس کی اجازت نہیں دیتی۔
اس وقت بھی جب ہم کسی کو جلا رہے ہوں یا قبر میں دبا رہے ہوں تو یہ سوچتے ہیں کہ اس کے بعد ہمیں کچھ کھانا پینا ہے۔

☆

انسان کو موقع ملتا ہے جو ہاتھ سے چلا بھی جاتا ہے اور دوبارہ مل بھی جاتا ہے۔

☆

گنپت نے بتایا کہ میں نے ایک بار اپنے ماضی کو بھلا دینے کے لیے دور دراز کا سفر کیا لیکن میں اس نتیجے پر پہنچا کہ انسان کہیں بھی چلا جائے اور کتنے ہی جتن کرے لیکن وہ ماضی کے دائرے ہی میں قید رہے گا اور اپنی گزری ہوئی زندگی کو کبھی بھلا نہیں سکتا۔

●●●

اچھوت

صفائی کرنے والے لڑکے نے دروازے پر لٹکی ہوئی خس کی میٹ پر پانی پھینکا اور کچھ دیر کے لیے ہوا ٹھنڈی ہوگئی۔

میں بستر کے ایک کنارے پر بیٹھ گیا اور کھڑکی کے باہر تکنے لگا۔ سڑک گرد آلود تھی اور دوپہر کی دھوپ میں تمازت تھی ایک کار کے گزرنے سے گرد بادلوں کی طرح فضا میں اڑنے لگی۔

سڑک کی دوسری طرف جو لوگ رہتے تھے وہ میری دیکھ ریکھ کر رہے تھے۔ ان دنوں میرے والد ملیریا ہونے کی وجہ سے اسپتال میں تھے۔ میں انھیں کے ساتھ رہتا، انھیں کے ساتھ سوتا لیکن ان کے ساتھ کھانا نہیں کھاتا تھا (الگ کھاتا تھا) کیوں کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتے تھے اور میں انھیں پسند نہیں کرتا تھا۔

غالباً ایک ہفتہ گزر چکا تھا اور میں تنہا لال اینٹوں والے بنگلے میں جو شہر سے دور جنگل کے کنارے تھا، تنہا رہ رہا تھا۔ رات کے وقت صفائی کرنے والا لڑکا چوکیداری کے لیے آتا اور رسوئی میں سو جاتا۔ پڑوس کے بچوں کے علاوہ میرے ساتھ کھیلنے کے لیے دوسرا کوئی نہ تھا۔ میں انھیں پسند نہیں کرتا تھا اور وہ مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔

ان بچوں کی ماں مجھ سے کہتی تھی کہ صفائی کرنے والے لڑکے کے ساتھ مت کھیلا کرو۔ وہ گندا ہے۔ اسے مت چھونا۔

میں نے ایک ہفتہ بستر پر بیٹھ کر گزارا اور اپنے والد کے گھر واپس آنے کا انتظار کرتا رہا۔

صفائی کرنے والا لڑکا پورے دن پانی کے ٹینک اور گھر کے درمیان تیزی سے اوپر نیچے آتا جاتا رہتا اور بالٹی اس کے گھٹنوں سے ٹکراتی رہتی۔ آتے جاتے ہوئے وہ ایک بکھری دوستانہ مسکراہٹ دیتا۔

میں نے اس کی طرف گھورا۔

وہ تقریباً میرا ہم عمر دس سال کا ہوگا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے گھنگھرالے بال اور بہت سفید دانت تھے۔ اس کا منہ اور ہاتھ پیر مٹی سے لت پت تھے اور وہ بہت خاکی رنگ کا چھوٹا سا جوڑا پہنتا اور جسم کا باقی حصہ کھلا ننگا رہتا۔ اس کی کھال جھلسی ہوئی تھی۔ ہر بار جب بھی وہ پانی کے ٹینک پر جاتا، نہا کر آتا اور سر سے پیر تک پانی میں شرابور اور بھیگا ہوا ہوتا جب کہ میرے جسم سے پسینہ ٹپک رہا ہوتا۔

ٹینک پر جا کر نہانا میرے رتبہ سے کم درجہ کی بات تھی۔ کیوں کہ وہاں مالی، پانی لانے والے، باورچی، نوکر اور مہتر جمع ہو کر نہاتے تھے۔ میں ایک بڑے آدمی کا بیٹا تھا اور رواج کے مطابق صاحب کے بچے نوکروں کے بچوں کے ساتھ نہیں کھیلتے تھے۔

لیکن میں نے دوسرے ''صاحب'' کے بچوں کے ساتھ نہ کھیلنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا، کیوں کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتے تھے اور میں انھیں پسند نہیں کرتا تھا۔

صفائی کرنے والے کا لڑکا مسکرایا اور کھیل کھیل میں اس نے سلام کیا۔ میں نے نظر انداز کرتے ہوئے اس سے کہا۔ ''چلے جاؤ!'' اور وہ رسوائی میں چلا گیا۔

میں اٹھا اور کمرے سے باہر آیا اور کیپ ہیٹ اسٹینڈ سے سورج سے بچنے والا کیپ ہیلمیٹ اٹھایا۔

ایک کنکھجورا دیوار پر رینگتا ہوا فرش پر آ گرا۔ میں ڈر سے چیختا ہوا بیڈ پر چڑھ گیا اور مدد کے لیے چلایا۔ صفائی کرنے والا لڑکا اندر کی طرف دوڑا۔ اس نے دیکھا کہ میں بیڈ پر چڑھا ہوا تھا اور کنکھجورا فرش پر پڑا تھا۔ اس نے الماری سے ایک بڑی سی کتاب اٹھائی

اور کتاب سے اس گھناؤنے کیڑے کو مار دیا۔

میں اپنے بیڈ پر ہی کھڑا رہا۔ میں ڈر سے کپکپا رہا تھا۔ وہ مجھ پر قہقہہ مار کر ہنسا اور میرا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''باہر چلے جاؤ۔''

میں اتنا ڈرا ہوا تھا کہ ہیٹ یا ہیٹ اسٹینڈ کو چھونے یا اس تک پہنچنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی اور میں بیڈ پر بیٹھ کر اپنے والد کے گھر واپس آنے کی خواہش کرنے لگا۔

ایک مچھر اڑتا ہوا میرے قریب آیا اور کان پر بھنبھنانے لگا۔ میں نے بددلی سے اس کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ بھاگ نکلا اور ڈریسنگ ٹیبل کے نیچے چھپ گیا۔

اسی مچھر کی وجہ سے میرے والد ملیریا کا شکار ہوئے اب وہ مجھے بھی اس مرض میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔

کھڑکی کے باہر پڑوسی کی ایک عورت ایک ہلکی سی مسکراہٹ دیتی ہوئی کمپاؤنڈ سے گزر گئی اور میں نے جواباً اسے گھورا۔

صفائی کرنے والا لڑکا بالٹی ہاتھ میں لٹکائے ہوئے دانت پیستا ہوا وہاں سے گزرا اور میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

رات کو میں نے لائٹ جلائے رکھی اور پڑھنے کی کوشش کی لیکن کتابیں بھی میری بے چینی ختم نہ کر سکیں۔

صفائی کرنے والے لڑکے نے گھر کے اندر چکر لگایا، دروازے بند کیے، کھڑکیاں بند کیں اور اس نے پوچھا: ''میرے لیے کوئی حکم؟''

میں نے اپنا سر ہلاتے ہوئے منع کر دیا۔

اس نے لائٹیں بند کیں اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اندر اور باہر سب طرف اندھیرا چھا گیا۔

صفائی کرنے والے لڑکے کے دروازے کی جھری سے کچھ روشنی دکھائی دے رہی تھی پھر وہ بھی بند ہو گئی۔

چاروں طرف سناٹا اور خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی نے مجھے پریشان کر دیا اور میں

سوچنے لگا کہ کاش میں اپنے پڑوسیوں کے ساتھ رہتا تو اچھا تھا۔

ایک چمگادڑ اڑتی ہوئی آئی اور سیدھی کھڑکی سے ٹکرا کر زمین پر گر گئی۔ پھر الو کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی آئی۔ میں نے محسوس کیا کہ بنگلے کے پیچھے گیدڑ چھپے ہوئے ہیں۔ ان کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ لیکن رات کا سناٹا اسی طرح چھایا رہا۔

صرف ایک ہوا کا جھونکا۔

پیڑوں کے پتوں کی سرسراہٹ سے میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ سوکھی ٹہنیوں کی سوکھی ہوئی پتیوں پر جیسے سانپ رینگ رہے ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ صفائی کرنے والے لڑکے کو کچھ دن پہلے ایک سانپ نے کاٹ لیا تھا۔

میں نہیں سویا کیوں کہ نیند ہی نہیں آئی۔ میں اپنے والد کو یاد کرنے لگا۔

شٹر اور دروازے سے کھڑکھڑ کی آواز سنائی دی۔

بھوت۔ یہ بھوت پریتوں کی رات تھی۔

اَے خدا، میں ان کے بارے میں کیا سوچ رہا ہوں۔

میرے والد! میرے والد جو ملیریا سے مر رہے تھے، میں نے انھیں پکار کر کہا کہ آؤ اور مجھے دیکھو۔

میں سوئچ کی طرف تیزی سے دوڑا اور سوئچ دباتے ہی کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ بیڈ پر لیٹ کر میں نے بہت سے کپڑوں سے اپنے آپ کو ڈھک لیا۔ میرا نائٹ سوٹ پسینے سے بھیگ گیا تھا۔

میں جسے اپنا والد سمجھ رہا تھا، وہ دراصل ان کی گون تھی جو غسل خانے کے دروازے سے لٹکی ہوئی تھی۔ شاید اسے وہ اسپتال لے جانا بھول گئے تھے۔

میں نے دوبارہ اُٹھ کر لائٹ بجھا دی۔

خاموشی باہر بڑھتی جا رہی تھی۔ میں کنکھجورے، سانپ اور اس سوئے ہوئے لڑکے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے چادر سے کس کر اپنا منہ ڈھک لیا تاکہ مجھے کچھ

دکھائی نہ دے اور پھر مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔

بجلی کی چمک نے سکوت توڑ دیا۔

بجلی کی تیز چمک آسمان کا سینہ چیرتی ہوئی اتنے قریب آ گئی تھی کہ چادر کے اندر سے بھی مجھے پیڑ اور گھر کا عکس واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے تکیے کو سمیٹ کر اپنے کان پر رکھ لیا اور چادر میں اچھی طرح چھپ گیا لیکن اس مرتبہ بجلی کی کڑک پہلے سے زیادہ تیز تھی اتنی تیز کہ اس سے پہلے شاید میں نے کبھی نہیں سنی تھی۔ میں اپنے بیڈ سے کودا اور بھاگ کر صفائی کرنے والے لڑکے کے کمرے میں جا گھسا۔

میں نے کہا: ''میں بہت ڈرا ہوا ہوں۔''

میں نے اس کی طرف آگے بڑھتے ہوئے اپنے ہاتھ سے اس کے کندھے کو چھوا جو ٹھنڈا تھا: ''یہیں ٹھہرو'' اس نے کہا، ''مجھے بھی ڈر لگ رہا ہے۔''

میں دیوار کی طرف پیٹھ کر کے اس اچھوت کے پاس بیٹھ گیا۔ بجلی کی چمک اور کڑک بند ہوگئی۔ بارش شروع ہوگئی اور جھری دار چھت سے چھم چھم اور ٹپ ٹپ ہونے لگی۔

صفائی کرنے والے لڑکے نے میری طرف مڑ کر کہا کہ بارش شروع ہوگئی ہے۔ وہ اندھیرے میں مذاق کے انداز میں مسکرایا اور پھر اس نے قہقہہ لگایا۔ میں بھی نحیف آواز میں ہنسنے لگا۔

میں بہت خوش تھا کیوں کہ میں اب اپنے آپ کو محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ بجلی چمکی۔ تیز بارش شروع ہوگئی اور گیلی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں پھیل گئی۔

●●●

ادنیٰ و اعلیٰ مخلوقات

ہندوستان میں رہ کر بڑا ہونے کے لیے میرے ساتھ بھائی اور بہنوں کے علاوہ عجیب طرح کے پالتو جانور موجود تھے۔ ان میں ایک بندر، ایک کچھوا، ایک اژدہا اور ایک بڑا ہندستانی ہارن بل تھا۔ ان جنگلی جانوروں کو گھر میں جمع کرنے کے لیے میرے دادا ذمّے دار تھے۔ ان کا اپنا مکان تھا۔ گھر کے لوگ ان جانوروں کو جمع کرنے پر اعتراض تو کر سکتے تھے لیکن ان کی ایک بڑی تعداد گھر میں رکھنے پر روک نہیں لگا سکتے تھے۔ خاندان کے لوگوں میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان میں میری دادی کے علاوہ کچھ باہر کی خواتین بھی شامل تھیں۔ کبھی کبھی سسرال سے بھی کچھ لوگ آیا کرتے تھے۔ اُن دنوں میرے والدین برما میں مقیم تھے۔ مجھے اور دادا کو اُن سب سے نپٹنے کے لیے بہت ہوشیار رہنا پڑتا تھا۔ پالتو جانوروں کے بارے میں ہم دونوں کی رائے ایک ہی تھی۔ جب بھی دادی یہ فیصلہ کر لیتیں کہ اب کسی پالتو سفید چوہے یا گلہری سے چھٹکارا پانے کا وقت آ گیا ہے تو میں انھیں جیک فروٹ کے پیڑ کے تنے کے ایک خول میں چھپا دیتا۔ میری آنٹی کو دادی جی کا یہ شوق پسند نہیں تھا لیکن میرے دادا اُن کے شوق کو کسی طرح برداشت کر لیتے تھے۔ کیونکہ دادی کو کچھ پالتو جانور پسند بھی تھے۔ دادا کا گھر اور جانوروں کا باڑہ دونوں دہرہ دون ہی میں واقع تھے۔ وہاں پر وہ بگھی میں بیٹھ کر جایا کرتے تھے اگرچہ اُن دنوں موٹر کاریں بھی تھیں۔ ابھی کوئی بیس سال پہلے ہی کی تو بات ہے۔ اگر تیز چلنے والے

چھوٹے دریا ٹومنز کے پار جانا ہو یا پھر تلہٹی کے علاقے میں جانا ہو تو اس سفر کے لیے تانگے کی سواری بھروسہ مند، تیز اور بہتر مانی جاتی تھی۔ برسات کے موسم میں دریا کی روانی تیز اور پانی گہرا ہو جاتا تھا۔ اس وقت ہاتھوں سے چلائے جانے والی کشتیوں کے بغیر دریا کے اس پار جانا ممکن نہیں تھا۔ سوکھے کے دنوں میں تو گھوڑا چھپ چھپ کر کے نکل جاتا تھا اور گاڑی کے پہیے بھی پہاڑ سے بہتے ہوئے پانی کو کاٹ کر نکل جاتے تھے۔ اگر گھوڑے کو ندی پار کرنے میں مشکل پیش آتی تو ہم لوگ جوتے اتار کر، قمیص کو بانہوں پر اور پیٹ کو اوپر چڑھا کر پانی میں گھس جاتے اور ندی پار کر لیتے تھے۔

اس صدی کی ابتدا میں جب دادا پہلی بار دہرہ دون رہنے کے لیے گئے تو وہاں پہنچنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ رات کو ڈاک گاڑی سے چلا جائے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ڈاک لے جانے والے خچر بہت ڈھیٹ قسم کے جانور ہیں۔ ہمیشہ مڑ مڑ کر یہی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ مسافروں کے ساتھ ڈبّے میں چڑھ جائیں۔ جب تک کہ کوچوان چابک کا اچھی طرح استعمال کر کے خچروں کی تین چار قطاروں کو دھونسا نہیں دیتا اور جب ایک بار وہ چلنا شروع کر دیتے ہیں تو پھر انھیں روکنے کی ضرورت پیش نہیں آتی اور وہ اچھلتے کودتے پہلے پڑاؤ تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں خچروں کو بدلا جاتا تھا۔ ساتھ میں کوچوان بگل بھی بجاتا تھا۔ سفر کے دوران نقارے بھی بجائے جاتے تھے۔ رات کے وقت جنگلی ہاتھیوں کو بھگانے کے لیے مشعلیں بھی جلائی جاتی تھیں۔ کبھی کبھی ہاتھی اس بے ترتیب قافلہ کو آتا ہوا دیکھ کر ناراض ہو کر چنگھاڑ کر للکارتے تھے۔ اس طرح خچروں میں افراتفری مچ جاتی تھی۔ دادا کو باہر گھومنے جانے کے لیے کپڑے بدل کر تیار ہونا پسند نہیں تھا۔ جب گھر کے لوگ بازار سے سامان خریدنے یا دہرہ دون کے پسندیدہ چھوٹے چھوٹے سنیما گھروں جیسے ہیرل لائٹ اور اے، ڈی کینٹر میں فلم دیکھنے چلے جاتے تھے تو وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ اس وقت وہ اپنے پالتو جانوروں کو کھانا کھلاتے اور باغیچے میں اِدھر اُدھر گھومتے تھے۔ انھیں بہت سے جانوروں کو کھانا کھلانا پڑتا تھا۔ گریٹ زینس کا ایک جوڑا اتنا کھاتا تھا کہ مجبور ہو کر اسے ایک امیر آدمی کو دینا پڑا۔ گریٹ زینس بہت نرم

مزاج کے جانور تھے۔ میں کبھی کبھی ان میں سے کسی ایک کے اوپر سواری کرتا اور باغیچے کی سیر کرتا۔ اپنے بھاری ڈیل ڈول کے باوجود ان کی چال سدھی ہوئی تھی۔ وہ نہ کبھی انسانوں سے ٹکراتے اور نہ بھی کرسی سے۔

ایک چھوٹا سا بندر تھا۔ ٹوٹو۔ اس نے بہت نقصان کیا تھا۔ دادا نے ٹوٹو کو ایک تانگے والے سے پانچ روپے میں خریدا تھا۔ تانگے والا اس چھوٹے سے لال بندر کو نہانے کی ایک چھوٹی سی ٹب میں باندھ کر رکھتا تھا۔ ٹوٹو وہاں اتنا عجیب لگتا تھا جیسے وہ کہیں پھنس گیا ہو۔ دادا جی نے اسے دیکھتے ہی اپنے پالتو جانوروں کے غول میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ٹوٹو حقیقت میں ایک چھوٹا سا خوبصورت بندر تھا۔ اس کی گہری بھوؤں کے نیچے شرارتی آنکھیں چمکتی رہتی تھیں۔ اس کے موتی جیسے چمکتے ہوئے دانت دکھائی دیتے تھے جن سے مسکراہٹ ٹپکتی تھی، جو بوڑھی اینگلو انڈین عورتوں کی جان سکھانے کے لیے کافی تھے۔ دادا کی ایک ہی پسندیدہ ہیروئن تھی، ٹاٹولہ بینک ہیٹ۔ ٹوٹو کے ہاتھ اس کی طرح نہیں تھے۔ وہ تو ایسے سوکھے اور سکڑے ہوئے تھے جیسے اچار کو دھوپ میں کئی مرتبہ سکھایا گیا ہو۔ اس کی انگلیاں کافی تیز اور چلبلی تھیں۔ اس کی پونچھ بہت اچھی تھی جو تیسرے ہاتھ کا کام کرتی تھی۔ دادا کہا کرتے تھے کہ پونچھ خوبصورتی بڑھانے میں مدد کرتی ہے۔ ٹوٹو اس پونچھ کا استعمال ٹہنیوں سے لٹکنے میں کرتا تھا اور جو چیز ہاتھ سے پکڑنے میں نہ آئے، اسے وہ اپنی پونچھ سے پکڑ لیتا تھا۔

دادی جانتی تھیں کہ رشتہ دار اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور کہیں گے۔ اس لیے جب بھی دادا نیا جانور یا پرندہ گھر میں لے کر آتے تو وہ اس پر ضرور ناراض ہوتیں۔ ہم نے ٹوٹو کی موجودگی کو چھپائے رکھنے کے لیے اسے اپنے سونے کے کمرے کی دیوار سے منسلک الماری میں رکھ دیا۔ لیکن کچھ ہی گھنٹوں کے اندر اس نے دادی کا خوبصورت وال پیپر اور میرے اسکول کے کوٹ کے کافی حصوں کا صفایا کر دیا۔ اس لیے اسے ایک دو دن کے لیے اصطبل میں رکھوا دیا گیا۔ اسی دوران دادا کو اپنی ریلوے پنشن لانے کے لیے ایک نزدیکی قصبے سہارنپور جانا پڑا۔ ٹوٹو کو تکلیف سے بچانے کی وجہ سے انھوں نے اسے

اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اتفاق سے اس سفر میں، میں ان کے ساتھ نہیں تھا۔ لیکن بعد میں ان کے ساتھ سفر کے دوران جو واقعہ پیش آیا وہ دادا نے مجھے بتا دیا۔

ٹوٹو کے لیے ایک کالا کٹ بیگ تھا۔ اس بیگ کو ڈوری سے باندھنے پر ٹوٹو کے لیے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا تھا۔ اس کی کینوس اتنی پکی تھی کہ ٹوٹو پورا زور لگا کر بھی اُسے کاٹ نہیں سکتا تھا۔ جب بھی اس نے نکلنے کی کوشش کی تو کِٹ بیگ فرش پر لڑھکنے لگتا یا پھر ہوا میں اُچھل جاتا۔ اس منظر کو دیکھ کر دہرہ ریلوے اسٹیشن پر تماش بینوں کی بھیڑ جمع ہوگئی۔

ٹوٹو بیگ میں صرف سہارنپور تک ہی رہا۔ جب دادا جی ریلوے کاؤنٹر پر اپنا ٹکٹ لے رہے تھے تو ٹوٹو ڈوری باندھنے کی جگہ پر ایک چھوٹے سے سوراخ میں سے اپنا ہاتھ نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے کسی طرح ڈوری کو ڈھیلا کر دیا اور جلدی سے کھلی جگہ سے اپنا سر باہر نکال لیا۔ بیچارے ٹکٹ کلکٹر کو کچھ خطرہ محسوس ہوا۔ اس نے بڑی تیزی سے دادا سے کہا: ''جناب آپ کے پاس تو ایک کتا بھی ہے۔ آپ کو اس کا ٹکٹ لینا پڑے گا۔''

دادا نے یہ ثابت کرنے کے لیے ایک بندر، کتا یا چوپایہ نہیں ہوسکتا ٹوٹو کو بیگ سے باہر نکال لیا۔ ٹی۔ ٹی چڑا ہوا تھا۔ وہ اپنی بات پر بضد رہا کہ ٹوٹو تو کتے کے زمرہ میں آتا ہے اور اس کا ٹکٹ تین روپیہ چار آنہ ہے، جو تمھیں لینا پڑے گا۔ دادا کو بھی غصہ آ گیا انھوں نے فوراً اپنی جیب سے ایک زندہ کچھوا نکالا، جو اُس وقت ان کے پاس تھا اور بولے: ''جب آپ سبھی جانوروں کا کرایہ وصول کر رہے ہیں، تو بتاؤ اس کا کرایہ کتنا دینا پڑے گا۔''

ٹی۔ ٹی اچانک دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور سنبھل کر آگے بڑھا اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ کچھوے کو دیکھنے لگا اور اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد وہ بولا: ''جناب اس کا ٹکٹ ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ کیڑے مکوڑوں کا کوئی کرایہ نہیں لگتا۔''

ہمیں جب معلوم ہوا کہ ٹوٹو کا پسندیدہ شوق چوہے پکڑنا تھا تو ہم نے دادی کو اسے گھر میں رکھنے کے لیے منا لیا۔ ہمارے خچروں کے گرائے ہوئے اناج کے دانے چگنے کے لیے چوہے بلا خوف و خطر رات کے وقت نکل آتے تھے مگر چوہوں کو دانہ چگنے کے

لیے اصطبل کے اس حصے سے گزرنا پڑتا تھا جہاں ٹوٹو رہتا تھا۔ ٹوٹو جان بوجھ کر اس طرح بیٹھ جاتا تھا جیسے وہ سویا ہوا ہو لیکن اس کی ایک آنکھ ہمیشہ کھلی رہتی تھی۔ چوہوں کا دوڑنا بیکار جاتا تھا۔ چوہوں کو دیکھتے ہی ٹوٹو انھیں بلی کی طرح اپنے پنجوں میں جکڑ لیتا تھا۔ دادی نے سوچا کہ ٹوٹو کی اس خوبی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس لیے انھوں نے ٹوٹو کو ایک رات کے لیے اس جگہ پر باندھ دیا جہاں پر گھر کے کھانے پینے کا سامان رکھا رہتا تھا اور چوہے ان چیزوں کو نقصان پہنچا رہے تھے۔

ٹوٹو کو اصطبل میں سے گھاس پھوس اور آرام دہ بستر سے اٹھا کر شیلف کے نیچے زنجیر سے باندھ دیا گیا۔ اس شیلف میں بہت سے جیم اور کھانے پینے کی لذیذ چیزیں رکھی تھیں۔ وہ رات ٹوٹو کے لیے بڑی تکلیف دہ اور لمبی رہی۔ وہ شاید یہی سوچتا رہا ہوگا کہ اس نے آخر کیا کیا ہے جو اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جا رہا ہے۔ چوہے رات بھر اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے رہے اور یہ بلّیوں سے بچنے کے لیے ایک کونے میں چھپا ہوا کچھ نیند لینے کی کوشش کرتا رہا۔ صبح ہوتے ہی چوہے واپس اپنے بلوں میں چلے گئے۔ ٹوٹو بھی جاگ گیا۔ اس نے ایک انگڑائی لی اور پھر کھانے کی غرض سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس نے جیم کے برتنوں کی طرف دیکھا اور فوراً ہی ایک کا ڈھکن کھول دیا۔ ان جیموں میں زیادہ تر دادی نے اپنے ہاتھ سے بنائے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹوٹو انھیں صاف کر گیا۔ اس وقت میں وہاں موجود تھا جب دادی نے یہ دیکھنے کے لیے کہ رات میں ٹوٹو نے کتنے چوہے پکڑے ہیں دروازہ کھولا۔ جب بارش کا دیوتا اِندر طوفان لاتا ہے تو کتنا خوف لگتا ہوگا لیکن اُس وقت دادی نے ٹوٹو پر جن بددعاؤں کی بوچھار کی وہ حقیقت میں حیران کر دینے والی تھیں اور خاص طور پر اس ہستی کے لیے جس کی پرورش وکٹورین تہذیب کے مطابق ہوئی ہو۔

بندر پھر دادی جی کا چہیتا بن گیا۔ سردی کے موسم میں جب اسے نہانے کے لیے گرم پانی کا ٹب دیا جاتا تھا، تو وہ اسے بہت پسند کرتا تھا۔ اسے خود نہانے میں بہت مزہ آتا۔ نہانے سے پہلے وہ اپنی انگلیوں سے پانی کا درجہ حرارت دیکھتا اور پھر آہستہ سے ٹب میں

گھس جاتا۔ پہلے وہ ایک پیر رکھتا اور پھر دوسرا پیر ٹب کے اندر ڈال دیتا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس نے مجھے کرتے ہوئے دیکھا تھا اور بعد میں وہ آرام سے اس میں بیٹھ جاتا۔ ایک بار ٹب میں بیٹھنے کے بعد وہ صابن کو اپنے ہاتھ یا پیر سے پکڑ لیتا اور پورے جسم پر مَلتا۔ جب اُسے یہ محسوس ہونے لگتا کہ پانی ٹھنڈا ہو رہا ہے تو وہ فوراً بال سکھانے کے لیے آگ کے قریب آ جاتا۔ اس کے اس عمل کے دوران اگر کوئی اس کو دیکھ کر ہنس پڑتا تو بہت برا مانتا تھا اور نہانے دھونے اور منہ صاف کرنے سے انکار کر دیتا تھا۔

ایک دن ٹوٹو موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچ گیا۔ پانی کی کیتلی آگ پر چائے بنانے کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ ٹوٹو اُس وقت گھر میں اکیلا تھا۔ اس نے کیتلی کا ڈھکّن اٹھایا۔ اُس وقت پانی ہلکا گرم تھا۔ وہ کیتلی میں نہانے کے ارادے سے گھس گیا اور اپنا سر کیتلی کے باہر نکال کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر اُسے اچھا لگا۔ جب آہستہ آہستہ پانی گرم ہونے لگا تو ٹوٹو اوپر کی طرف اٹھا لیکن باہر سردی تھی۔ اس لیے دوبارہ پھر کیتلی میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح اٹھتا بیٹھا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ باہر کی ٹھنڈی ہوا کا سامنا کر سکے۔ اگر دادی وقت پر نہ آتیں تو وہ اُبل کر پک گیا ہوتا۔

دماغ کا اگر کوئی حصہ شرارت کرنے کے کام آتا ہے تو وہ ٹوٹو میں کافی حد تک موجود تھا۔ وہ ہمیشہ چیزوں کے ٹکڑے کرتے رہتا۔ جب بھی میری کوئی آنٹی اُس کے قریب آتیں تو اُس کی یہی کوشش رہتی کہ کسی نہ کسی طرح ان کے کپڑوں کا کوئی حصّہ پھاڑ دے یا پھر اُس میں سوراخ کر دے۔ کئی آنٹیاں ہمارے دادا اور دادی کے پاس رہنے کے لیے آتی تھیں لیکن ٹوٹو کی وجہ سے وہ ایک یا دو دن ہی ٹھہر پاتی تھیں۔ اس وجہ سے دادا زیادہ تر راحت محسوس کرتے تھے لیکن دادی دل ہی دل میں کڑھتی رہتی تھیں۔

دادی سے مار کھانے کے باوجود ٹوٹو انھیں کو پسند کرتا تھا۔ جب بھی وہ اسے پیار کی نگاہ سے دیکھتیں تو وہ ان کی گود میں آ کر آرام سے لیٹ جاتا تھا جبکہ دوسرے لوگوں کے پاس وہ اِدھر اُدھر اور اوپر نیچے ہلتا رہتا تھا۔ ٹوٹو ہمارے ساتھ ایک سال سے کچھ زیادہ ہی رہا لیکن پچھلی سردیوں میں زیادہ نہانے کی وجہ سے اُسے ٹھنڈ لگ گئی اور نمونیا ہو گیا۔ دادی

نے اسے فلالین کے کپڑے میں لپیٹ دیا اور دادا نے اسے چکن سوپ اور آئرش اسٹو بھی کھلا دیا لیکن ٹوٹو ٹھیک نہیں ہوا۔ اُس کی موت ہو گئی اور باغیچے میں اس کے ایک من پسند آم کے پیڑ کے نیچے اسے دفنا دیا گیا۔

دادا گھر میں جب اژدہا لے کر آئے تھے تو اس وقت ٹوٹو ہمارے پاس نہیں تھا۔ شاید یہ ٹھیک ہی ہوا، ورنہ اُس کی موت فطری طور پر نہ ہوتی کیونکہ اژدہے کو چھوٹے بندر بہت لذیذ لگتے ہیں۔ بیشتر پرندوں اور جانوروں کو تو دادی برداشت کر لیتی تھیں لیکن جہاں تک رینگنے والے جانوروں کی بات ہے وہ کوئی سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ انھیں دیکھ کر اُن کا خون ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ایک خوبصورت اور اچھے گرگٹ کو چھوڑ دینا پڑا تھا۔ ان حالات میں دادا کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اژدہے کو گھر میں رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ چھوٹا ہوتے ہوئے بھی چار فٹ لمبا تھا۔ دادا اسے چھ روپے میں ایک سپیرے سے خرید کر لائے تھے اور اسے کندھے پر لٹکا کر بازار میں لوگوں کو دکھاتے ہوئے پیدل ہی گھر تک آئے تھے۔ جب دادی نے دیکھا کہ دادا کی گردن سے سانپ لپٹا ہوا ہے تو ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ وہ چلائیں: ''تمھارا دم گھٹ جائے گا، اس کو پھینک دو۔''

دادا نے کہا۔ ''کیا بکواس کرتی ہو۔ یہ ابھی بہت چھوٹا ہے جلدی ہی اسے ہماری عادت پڑ جائے گی۔''

دادی بولیں۔ ''اچھا، اسے ہماری عادت تو پڑ جائے گی لیکن اس کی عادت ڈالنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تمھیں پتا ہے کہ تمھاری چچیری بہن ''میبل'' کل ہمارے ساتھ رہنے آ رہی ہے۔ جب اسے پتہ چلے گا کہ گھر میں سانپ ہے تو وہ اس وقت گھر چھوڑ کر ہی جائے گی۔''

دادا جی بولے، ''اچھا، پھر تو اُسے آتے ہی سانپ دیکھنا چاہیے۔''

دادی بولیں، ''تم ہرگز ایسا کوئی بھی کام نہیں کرو گے۔''

دادا بڑے معصومانہ انداز میں بولے، ''ٹھیک ہے میں اسے باغیچے میں کھلا ہوا نہیں

چھوڑ سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مرغیوں کے ڈربے میں گھس جائے تو پھر ہم کہاں جائیں گے۔''

دادی بڑبڑائی، ''تم کیوں تنگ کرتے ہو۔ اس جانور کو غسل خانے میں بند کر دو۔ بازار واپس جاؤ اور اِسے جس سے خریدا تھا اسے ڈھونڈو۔ اسے پکڑ کر لاؤ اور اسے کہو کہ اسے واپس لے جائے۔''

مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ آخر کار دادا اژدہے کو غسل خانے میں لے گئے۔ وہاں اُسے پیچھے کنارے والے ایک ٹب میں رکھ دیا۔ پھر وہ جلدی سے بازار میں سپیرے کو ڈھونڈنے نکل پڑے۔ اس دوران دادی برآمدے میں ادھر سے ادھر ٹہلتی رہیں۔ جب دادا منہ لٹکائے ہوئے بازار سے واپس آئے تو ہمیں معلوم ہو گیا کہ سپیرا نہیں ملا۔

دادی نے غصے میں کہا، ''اب تم اسے اپنے ساتھ جنگل میں لے جا کر دریا کے کنارے ریت پر چھوڑ آؤ۔''

دادا بولے، ''ٹھیک ہے۔ لیکن پہلے اسے کچھ کھلانے تو دو۔ وہ ایک چوزا لے کر غسل خانے میں گھسے۔ ان کے پیچھے پیچھے میں، دادی، رسوئیا اور مالی سب ایک قطار میں آ گئے۔ دادا نے بڑی تیزی سے دروازہ کھولا اور غسل خانے میں قدم رکھا۔ میں نے اس کی ٹانگوں کے بیچ سے جھانکا۔ باقی لوگ میرے پیچھے تھے۔ لیکن اژدہا دکھائی نہیں دیا۔

دادا نے چیخ کر کہا۔ ''وہ ضرور بھوکا ہوگا۔''

میں نے کہا، ''مجھے لگتا ہے کہ وہ اتنا زیادہ بھوکا نہیں ہے۔''

دادی نے گھبراتے ہوئے کہا، ''دراصل ہم سے کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔'' اژدہے کی تلاش میں رسوئی، باغیچہ، اصطبل بلکہ سارے گھر کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن اژدہے کا کہیں پتہ نہیں چلا۔ دادا نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ اب تک وہ کافی دور نکل گیا ہوگا۔ میری دادی نے بھی یہی کہا کہ مجھے بھی ایسا لگتا ہے۔ لیکن وہ تلاش و تجسس کی کیفیت میں تھیں۔

آنٹی 'میبل' تین ہفتے کے لیے آئی تھیں۔ ایک دو دن تو دادا اور مجھے یہی ڈر لگا رہا کہ کہیں اژدہا اپنے آپ ظاہر نہ ہو جائے لیکن جب وہ تیسرے دن بھی سامنے نہیں آیا تو ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔

اچانک ایک دن شام کے وقت ہمیں باغیچے کی طرف سے چیخ سنائی دی تو ہم لوگ چونک گئے۔ چند لمحوں بعد آنٹی 'میبل' سیڑھیوں سے کودتی ہوئی برآمدے میں آ گئیں۔ انھیں دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ انھوں نے کوئی بھوت دیکھا ہو۔ وہ ہانپتی ہوئی بولیں: ''امرود کے پیڑ میں۔ جب میں ایک امرود توڑنے ہی والی تھی تو وہ میری طرف آنے لگا۔ اُس کی آنکھیں دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے کھا جائے گا۔''

دادی نے اس کے زخم پر یوڈی کلون چھڑکتے ہوئے کہا: ''تسلی رکھو۔ پیاری تسلی رکھو۔ بتاؤ تو سہی تم نے کیا دیکھا؟''

آنٹی میبل نے گھبراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ایک بہت بڑا سانپ دیکھا جو جسم سے لپٹ کر انسان کو مار ڈالتا ہے۔ میں نے امرود کے پیڑ پر بیس فٹ لمبا سانپ دیکھا۔ اُس کی آنکھیں بڑی خوفناک تھیں۔ ایسا سانپ جسم سے لپٹ کر انسان کو مار ڈالنے والا ہوتا ہے۔ اس نے میری طرف ایسی عجیب نگاہوں سے دیکھا کہ۔۔۔''

میرے دادا دادی نے ایک دوسرے کو حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

دادا نے کہا۔ ''میں جا کر اسے مار دیتا ہوں۔'' اور انھوں نے ایک بھیگی بلی کی طرح چھتری اُٹھائی اور بڑی آہستہ روی سے باغیچے کی طرف چل پڑے۔ لیکن جب تک وہ امرود کے پیڑ تک پہنچتے وہ اژدہا غائب ہو چکا تھا۔

میں نے کہا۔ ''آنٹی میبل نے اُسے ڈرا کر دور بھگا دیا ہوگا۔''

دادا بولے۔ ''خاموش۔ آنٹی کے بارے میں ایسا نہیں کہنا چاہیے۔'' لیکن ان کی آنکھوں سے خفیف سی مسکراہٹ ٹپک رہی تھی۔

اس کے بعد وہ اژدہا کئی بار دکھائی دیا۔ کبھی کبھی تو وہ ایسی جگہ دکھائی دے جاتا جہاں اس کے ہونے کی امید بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ آنٹی میبل تو اس وقت تقریباً بے ہوش ہی ہو گئی تھیں جب انھوں نے اسے ایک تکیے کے نیچے سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ ان کو عجیب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے تو اپنا سامان باندھ لیا لیکن دادی نے ہمیں اژدہے کی تلاش کرنے پر مجبور کر دیا۔ دوسرے دن صبح کے وقت میں نے اژدہے کو

ڈریسنگ ٹیبل پر کنڈلی مار کر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ شیشے میں اپنے آپ کو ٹک ٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ میں دادی کو بلانے گیا اور وہ ہمارے واپس آنے تک وہاں سے جا چکا تھا۔ اس کے کچھ دیر بعد وہ باغیچے میں دکھائی دیا۔ پھر وہ دوبارہ ڈریسنگ ٹیبل پر دکھائی دیا۔ وہ اپنی خوبصورتی کو بہت خوشی کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اُسے شیشے میں اپنا وجود بہت خوبصورت لگتا ہوگا۔ دادا نے کہا: ''اس کی طرف ہر آدمی توجہ دے رہا ہے، شاید اسی لیے وہ خود پسند ہوتا جا رہا ہے۔''

میں نے کہا: ''اسی لیے اچھا لگنے کی کوشش کر رہا ہے کہ شاید آنٹی مبیل کو پسند آجائے۔''

لیکن یہ کہنا مجھے بہت مہنگا پڑا اور دادی نے مجھے یہ کہتے ہوئے سن لیا تھا اور تڑاک سے ایک تھپڑ میرے سر پر پڑ گیا۔

دادا نے کہا۔ ''اچھا اب ہم اس کی کمزوری سمجھ گئے ہیں۔''

دادی نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ ''تو آپ بھی اب مذاق کر رہے ہیں۔''

دادا نے فوراً جواب دیتے ہوئے کہا ''میرے کہنے کا مطلب یہی ہے کہ اب یہ گھمنڈی ہو رہا ہے اس لیے اسے پکڑنا آسان ہو جائے گا۔''

انھوں نے ایک بڑا سا پنجرہ تیار کیا جس کے ایک طرف شیشہ لگا ہوا تھا۔ پنجرے میں انھوں نے ایک چوزا اور کھانے کی بہت سی چیزیں رکھ دیں۔ اس پنجرے کے دروازے کے ساتھ ایک ٹریپ ڈور لگا دیا۔ جب تک یہ پنجرا تیار ہوا آنٹی مبیل جا چکی تھیں لیکن ہمیں تو یہ کام پورا کرنا ہی تھا کیونکہ اژدہے کو ہمیشہ کے لیے گھر میں گھومنے پھرنے نہیں دیا جا سکتا تھا۔

کچھ دن تو اس کا پتہ نہیں چل پایا۔ ایک دن صبح کے وقت جب میں اسکول میں جا رہا تھا تو میں نے اژدہے کو پنجرے میں کنڈلی مار کر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہاں رکھی ہوئی چیزیں وہ کھا چکا تھا اور شیشے کے سامنے آرام کر رہا تھا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ اژدہے مسکرا بھی سکتے ہیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسکرا رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے ٹریپ ڈور کو بند کر دیا۔ اژدہے نے میری طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ تو شیشے میں اپنے وجود کی خوبصورتی کو

دیکھ کر خوشی محسوس کر رہا تھا۔ دادا اور مالی نے مل کر اس پنجرے کو خچر کے اوپر رکھا اور دریا کے اُس پار چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے ٹریپ ڈور کھول کر اژدہے کو جنگل میں چھوڑ دیا۔

دادا نے بعد میں بتایا کہ اس نے پنجرے سے باہر نکلنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ شیشہ واپس نکال سکوں۔ میں نے پہلی مرتبہ کسی سانپ کو پیار کے جال میں پھنستے ہوئے دیکھا!

''مینڈک ہمیشہ مٹی میں رہ کر ہی اپنا پرانا راگ الاپتا ہے۔'' ورجل کی یہ کہاوت دادا جی کو بہت پسند تھی۔ اکثر جب ہم گھر کے پیچھے پانی کے ایک تالاب پر جایا کرتے، دادا جی اس کہاوت کو دہرایا کرتے تھے۔ اس چھوٹے سے تالاب میں کیچڑ اور مینڈک تو ہوتے ہی تھے ان کے علاوہ اِکا دُکا بھینس بھی ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ دادا بہت سارے مینڈک گھر پر لے آئے اور ان مینڈکوں کو ایک شیشے کے برتن میں ڈال کر کھڑکی میں رکھ کر بھول گئے۔ صبح چار بجے کے قریب پورا گھر ایک زوردار اور ڈراؤنی آواز کی وجہ سے جاگ اٹھا۔ دادا اور کئی دوسرے رشتہ دار نائٹ سوٹ ہی پہنے ہوئے برآمدے میں جمع ہو گئے۔ سب لوگ گھبرائے ہوئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ آواز تو دادا کے مینڈکوں کی ہے۔ ان کی گھبراہٹ غصّے میں بدل گئی۔ ہوا یہ تھا کہ جب مینڈکوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ صبح ہونے والی ہے تو انھوں نے صبح صادق کا نغمہ چھیڑ دیا۔ دادا تو برتن سمیت مینڈکوں کو باہر پھینک دینا چاہتے تھے لیکن دادی نے مشورہ دیا کہ اگر برتن کو اچھی طرح ہلا دیا جائے تو یہ خاموش ہو جائیں گے۔ اس لیے وہ کافی دیر تک جاگتے بھی رہے کہ اگر مینڈک پھر اپنا راگ الاپنا شروع کر دیں تو وہ برتن کو ہلا کر انھیں خاموش کر دیں۔ اتفاق سے ایک نوکر نے یہ جاننے کے لیے کہ برتن میں ہے کیا، برتن کا ڈھکن کھول دیا اور برتن میں موجود بڑے بڑے مینڈکوں کو دیکھ کر وہ چونک پڑا اور ڈھکن بند کیے بغیر بھاگ گیا۔ مینڈک چھلانگ لگا لگا کر باہر نکل آئے اور شاید وہ تالاب میں واپس چلے گئے۔

مجھے تالاب کے نشیب و فراز اور ساحل کو دیکھنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ میں نے

جوتے اُتارے اور تالاب کے کیچڑ والے حصّے میں جہاں گھٹنوں تک پانی تھا، پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے پھولوں کو چننے کے لیے چلا جاتا تھا۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ تالاب میں پہلے سے کئی بھینسیں تیر رہی تھیں۔ ان بھینسوں کی رکھوالی ایک لڑکا کر رہا تھا جو عمر میں مجھ سے کچھ بڑا تھا۔ وہ لڑکا تالاب کے بیچ میں تیرتا ہوا دکھائی دیا۔ تالاب کے کنارے پر آنے کے بجائے وہ کسی نہ کسی بھینس پر چڑھ جاتا اور اپنے بھورے رنگ والے چکنے جسم کو بھینس کی چمکتی ہوئی چکنی کھال پر پھیلا دیتا اور پھر کچھ گنگنانے لگتا۔ اس نے مجھے تالاب کی طرف سے ٹک ٹکی باندھ کر دیکھا اور مسکرایا۔ اُس کے چمکتے ہوئے دانت اور دھوپ سے جھلسا ہوا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے تیر کر اپنے پاس آنے کے لیے کہا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں تیرنا نہیں جانتا۔ اس نے مجھے تیرا کی سکھانے کی پیش کش کی۔ میں ہچکچایا۔ مجھے معلوم تھا کہ دادا گاؤں کے بچوں کے ساتھ ملنے جلنے کو پسند نہیں کرتے تھے، کیونکہ وہ اس معاملے میں تنگ دل اور دقیانوسی واقع ہوئے تھے۔ میں نے یاد کیا کہ دادا اکثر چھپ کر حقے کا کش لگایا کرتے تھے۔ وہ مجھے بھی کسی پریشانی سے بچالیں گے۔ یہی سوچ کر ہمت کر کے میں نے لڑکے کی پیش کش مان لی حالانکہ یہ کوئی بہادری کا کام نہیں تھا۔

اس نے بھینس کی پیٹھ سے چھلانگ لگائی اور تیرتا ہوا میری طرف آ گیا۔ میں نے بھی اپنے کپڑے اُتار دیے اور اس کی ہدایتوں پر عمل کرتے ہوئے تیرتا ہوا پانی میں پھولوں کے بیچ میں پہنچ گیا۔ اس کا نام رامو تھا۔ اس نے ہر روز دوپہر کے وقت تیرا کی سکھانے کا وعدہ کیا۔ اس طرح تقریباً گرمی کی ہر دوپہر کو جب سب لوگ سو رہے ہوتے تھے ہم دونوں اکثر ملا کرتے تھے۔ میں نے بھی تالاب میں تیر کر بھینس کی سواری کرنا سیکھ لیا تھا۔ اب میں اور رامو بھینس پر سواری کر رہے ہوتے تو وہ بھینس اس طرح اطمینان کے ساتھ کھڑی ہو جاتی جیسے کیچڑ کے اندر ایک دِیار کھا ہو۔

کبھی کبھی ہم دونوں الگ الگ بھینسوں پر بیٹھ کر انھیں تالاب میں دوڑایا کرتے تھے۔ لیکن وہ بہت سست جانور تھے اور ایک آرام دہ جگہ سے دوسری آرام دہ جگہ پر جا کر کھڑے

ہو جاتے تھے۔ جب وہ کھیلنے کے موڈ میں نہیں ہوتے تو وہ پیٹھ کے بل لیٹ جاتے اور ہمیں بھی اپنے ساتھ کیچڑ اور کائی میں ڈال دیتے۔ ہری اور بھوری مٹی سے لپٹا ہوا میں گھر میں داخل ہوتا اور غسل خانے میں جا کر نہا دھو کر کپڑے پہن لیتا تھا۔ ایک دن دوپہر کے وقت مجھے اور رامو کو کیچڑ میں ایک چھوٹا سا کچھوا ملا۔ وہ ایک بِل کے منہ پر بیٹھا ہوا تھا اور اس نے بہت سارے انڈے بھی دیے ہوئے تھے۔ رامو نے انڈے اپنے رات کے کھانے کے لیے رکھ لیے اور میں نے کچھوے کو دادا جی کی نذر کر دیا۔ کچھوے دادا کی کمزوری تھے اور جب یہ کچھوا اُن کے جانوروں کے غول میں شامل ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے اسے پانی کے ایک ایسے ٹب میں رکھ دیا جس میں پتھروں کا ایک بڑا جزیرہ بنا ہوا تھا۔ کچھوا ٹب سے باہر نکل کر پورے گھر میں گھومتا رہتا تھا۔ جب ہمیں یہ محسوس ہوا کہ یہ اپنی دیکھ بھال خود ہی اچھی طرح کر لیتا ہے تو ہم نے بھی اس پر روک ٹوک بند کر دی۔ اگر کوئی کتا اسے زیادہ تنگ کرتا تو یہ اپنا سر اور ٹانگیں خول میں چھپا لیتا اور چھینا جھپٹی کی ساری کوششیں ناکام کر دیتا۔

رامو ایک مزدور گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ کبھی اسکول بھی نہیں گیا تھا مگر پھر بھی بہت سے قصے کہانیاں اُسے یاد تھیں اور جانوروں اور پرندوں کے بارے میں بھی اُسے کافی معلومات تھی۔ ایک دن ہم نے دیکھا کہ ایک نیلے رنگ کا پرندہ بلیو جل پیپل کے پیڑ پر جھپٹا اور ایک جھینگر کو اُٹھا کر اُڑ گیا۔ رامو نے بتایا کہ کچھ پرندے مقدس مانے جاتے ہیں۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ بلیو جیل اور بھگوان شیو دونوں ہی نیل کنٹھ کہلاتے ہیں۔ کچھ پرندوں کی طرح بھگوان شیو جی کی گردن کا رنگ نیلا ہے۔ انسانیت کے تحفظ کے لیے انھوں نے وہ ہلاہل زہر پیا تھا جس سے ساری دنیا تباہ ہو سکتی تھی۔ انھوں نے سارا زہر اپنے کنٹھ میں رکھ لیا۔ اس وقت میں نے پیپل کی ٹہنی سے گلہری کو تیزی سے نیچے اترتے ہوئے دیکھا اور رامو سے پوچھا۔ ''کیا گلہری بھی مقدس ہو سکتی ہے؟'' رامو نے کہا: ''ہاں، بھگوان کرشن گلہریوں سے ہی پیار کرتے تھے۔ وہ انھیں بانہوں میں لے کر اپنی لمبی انگلیوں سے سہلایا کرتے تھے اس لیے تو ان کی پیٹھ پر سر سے پونچھ تک چار کالی

لائنیں پڑی ہوئی ہیں۔ کرشن سانولے رنگ کے تھے اور یہ لائنیں اُن کے انگلیوں کے نشان ہیں۔''

رامو اور دادا دونوں ہی اس بات پر یقین کرتے تھے کہ جانوروں کے ساتھ نرم رویہ ہونا چاہیے اور انھیں زیادہ نہیں مارنا چاہیے۔

دادا کہا کرتے تھے: ''انھیں عزت دینا بھی بڑی اہم بات ہے۔ ہمیں ان کے حقوق کو بھی سمجھنا چاہیے۔ پرندوں اور جانوروں کے لیے ہر جگہ زندہ رہنا بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے، کیونکہ ہم اُنھیں اور اُن کے جنگلوں کو ختم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ جوں جوں درخت ختم ہو رہے ہیں انھیں بھی اپنی جگہ ختم کرنی پڑ رہی ہے۔''

دہرہ کے گرد و نواح میں جنگلوں کے درخت کاٹے جا رہے تھے، جس سے چیتا، پرندے اور بونڈی والے ہرنوں کی نسل ختم ہو رہی تھی۔ رامو اور میں گرمیوں کی دوپہر میں اکثر تالاب کے کنارے گزارا کرتے تھے۔ دہرہ چھوڑتے وقت میری اُس سے ملاقات نہ ہو سکی لیکن مجھے اُس کی بہت یاد آتی ہے۔ وہ لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا تھا، شاید اسی لیے ہمارا ایک دوسرے سے رابطہ بھی قایم نہ رہ سکا۔ میری اور رامو کی دوستی کے بارے میں ہمارے یا اس کے رشتہ داروں کو پتہ بھی نہیں تھا۔ صرف بھینسیں اور مینڈک ہی ہمارے راز داں تھے۔ انھوں نے تالاب کے کیچڑ والے آرام دہ حصے کو اپنی دنیا سمجھ کر اسے زندگی کا ایک ناگزیر حصہ تصور کر لیا تھا۔ میرے دہرہ چھوڑتے وقت وہ یہ تصور کر رہے تھے کہ پرندوں کی طرح میں بھی دوبارہ ضرور واپس آؤں گا۔

●●●

دہرہ دون کو واپسی

سفر ختم ہونے کے بعد ہمیشہ کسی ڈر سے مجھے کپکپی محسوس ہوتی تھی اور وہ شاید اس وجہ سے کہ میں اپنے والد کے انتقال کے بعد پہلی بار گھر واپس جا رہا تھا۔

بہت پہلے کی بات ہے۔ 1944 میں سردی کا موسم تھا۔ ریل گاڑی سال کے گھنے جنگلوں سے ہوتی ہوئی دہرہ کے قریب پہنچ رہی تھی اور ہر لمحہ میں اپنی ماں کے پاس پہنچنے کا انتظار کر رہا تھا کیونکہ میں چار سال بعد ان سے ملنے والا تھا۔ طلاق کے بعد میں نے سوتیلے باپ کو صرف دو ایک بار ضرور دیکھا تھا۔

میری عمر گیارہ سال تھی اور میں دہرہ واپس آ رہا تھا۔ علیحدگی سے تین سال پہلے میں اپنے والد کے ساتھ دہلی جا کر رہا تھا۔ ہم دونوں بہت خوش رہتے تھے۔ ان دنوں وہ آر اے ایف نئی دہلی میں ملازم تھے اور ہم ہمایوں کے مقبرے کے قریب ایک بڑے کیمپ میں رہا کرتے تھے۔ اب تو اس علاقے میں بہت بھیڑ رہتی ہے لیکن ان دنوں وہاں گھنا جنگل تھا۔ کالے ہرن اور نیل گائیں عام طور پر آوارہ گھومتے پھرتے تھے۔ ہم لوگ مقبرے سے گھومتے ہوئے پرانے قلعہ تک پیدل آثارِ قدیمہ کی تلاش کرتے ہوئے نکل جاتے تھے۔ اس کے علاوہ تصویریں دیکھتے۔ جارج کی بنائی ہوئی مضحکہ خیز تصویریں مجھے پسند تھیں اور ٹکٹ جمع کرتے اور کتابیں وغیرہ خریدتے تھے۔ میرے والد نے اسکول میں داخلہ سے پہلے پڑھنا لکھنا سکھایا تھا اور جنگ ختم ہونے کے بعد مجھے انگلینڈ بھیجنے کا ارادہ

کرلیا تھا۔

موسم سرما کے چھ مہینے بہت سکون سے گزرے اور گرمیاں شروع ہوگئی تھیں لیکن پنکھا چلانے کی ضرورت محسوس نہیں ہورہی تھی۔ بانس کا بنا ہوا 'خس' کا ایک موٹا پردہ دروازے پر پڑا ہوا تھا جس پر بشتی اپنے مشکیزے سے ہمارے اور ہماری طرح کے دوسرے کیمپوں کے خس کے پردوں پر بھی ہر گھنٹہ کے بعد پانی چھڑک دیتا تھا۔ آج بھی مجھے خس کی بھینی بھینی خوشبو اور گیلی مٹی کی وہ بو یاد ہے، جو پردہ کے باہر پانی پھیل جانے پر اٹھتی تھی۔

وہ کتنا اچھا وقت تھا جو نہیں رہا۔ میرے والد پر ملیریا کا حملہ ہوا اور نتیجہ کے طور پر انھیں ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ بشتی کا چھوٹا لڑکا رات کو میرے ساتھ سوتا تھا اور دن کے وقت میں ایک اینگلو انڈین فیملی کے یہاں کھانا کھالیتا تھا جو سڑک کے دوسری طرف رہتی تھی۔

جب کبھی میرے والد کہیں باہر جاتے تو میرے لیے اس طرح کا انتظام کردیتے۔ میں اس طرح سے رہنے میں خوش تھا۔ لیکن کسی نے ائیر ہیڈ کوارٹر میں انھیں مشورہ دیا کہ وہ بورڈنگ اسکول میں میرے رہنے کا بندوبست کردیں۔ انھوں نے جنگ ختم ہونے کے بعد مجھے بورڈنگ میں بھیجنے کا فیصلہ کرلیا۔ میرے لیے یہی بہتر تھا اور جون 1943 میں میرا داخلہ ابتدائی درجہ میں شملہ کے ایک اسکول میں کرادیا گیا۔

حالانکہ میرا داخلہ بہ آسانی انگلینڈ کے کسی پبلک اسکول میں ہوسکتا تھا۔ وہاں کا طالب علم ہونا اپنے میں بڑے فخر کی بات تھی۔ اس اسکول کے طور طریقے، کھیل کود، بچوں سے ہنسی مذاق، چیپل میں حاضری، اسکول کے آنر بورڈ پر کپتان کی حیثیت سے نام اور دوسری سرگرمیوں میں حصہ لینا غرض کہ وہاں تعلیم حاصل کرنے سے ایک مکمل شخصیت کی تعمیر ہوسکتی تھی۔ ''ٹام براؤنڈ'' کو وہاں پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ لیکن اس طرح کی تعلیم و تربیت مجھے حاصل نہ ہوسکی۔

میرے والد مجھے پابندی سے خط لکھتے تھے جس میں مجھے آگے بڑھنے کے لیے نصیحت لکھی ہوتی تھی۔ سردی کی چھٹیوں میں میں ان سے ملنے جاتا تھا اور گرمی کی چھٹیوں میں

وہ مجھ سے ملنے شملہ آجاتے تھے اور اس دوران ہم باہر گھومنے جاتے اور اکثر ہم جاکو پہاڑی کے شمال میں واقع Graig-Dhu ہوٹل میں ٹھہرتے تھے۔ یہ ہمارا ایک دلکش ہفتہ ہوتا تھا۔ اس دوران ہم پیدل گھومتے، سورج کی روشنی میں آئس کریم کھاتے، بھوت پریت کی کہانیوں کی باتیں کرتے، کتابوں کی دکان پر کھڑے ہوکر اِدھر اُدھر سے کتابیں پڑھتے اور آئندہ سال انگلینڈ جانے کا پروگرام بناتے تھے۔

والد کے جانے کے بعد مجھ میں بددلی پیدا ہوجاتی اور اسکول میں سب کچھ بکواس لگنے لگتا تھا۔ ان کا کلکتہ تبادلہ ہوگیا تھا۔ وہاں اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ پہلے دوبارہ ملیریا ہوگیا، اس کے بعد یرقان کا حملہ ہوا۔ ان کا آخری خط خوشیوں سے بھرا ہوا تھا کہ وہ اپنے قیمتی ٹکٹوں میں سے کچھ ٹکٹ بیچ رہے ہیں کیونکہ انھیں انگلینڈ جانے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔

ایک دن میری کلاس ٹیچر نے مجھے بلایا اور کہا کہ ''بونڈ! ادھر آؤ تم سے کچھ بات کرنی ہے۔ چلو باہر چلتے ہیں۔'' میں سمجھ گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔

ہم دونوں دیودار کے جنگل سے ہوتے ہوئے کونسل بلاک سے آگے نکل گئے جہاں اسکاؤٹوں کی میٹنگ ہورہی تھی۔ جیسے ہی میری کلاس ٹیچر نے (بلاشبہ ہیڈ ماسٹر نے یہ خراب کام اُس کے سپرد کیا ہوگا) یہ ذکر کرنا شروع کیا کہ ''خدا تمھارے والد کو ایک اچھا اور اونچا مقام دینا چاہتا ہے، جو جاکو پہاڑی سے کہیں بہتر ہے جہاں وہ گرمی کی چھٹیوں میں آیا کرتے تھے۔'' تو یہ سنتے ہی میں سمجھ گیا کہ میرے والد فوت ہوگئے ہیں اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اُنھوں نے مجھے کچھ دنوں کے لیے ہسپتال میں داخل کرادیا اور میں ٹھیک ہونے تک وہیں پر رہا۔ میرے ہیڈ ماسٹر مجھ سے ملنے ہسپتال آئے تو مجھ سے میرے والدہ کے ڈھیر سارے خط جو میرے پاس جمع تھے لے گئے۔

''یہ تمھارے والد کے خطوط ہیں۔ تم سے کھو سکتے ہیں۔ انھیں میں اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔ جب تم چھٹیوں میں گھر جاؤ گے تو انھیں مجھ سے لے لینا۔'' میں نے بلا تامل وہ

خطوط ان کے سپرد کر دیے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ تمھاری ماں نے کہا ہے کہ تم سال کے آخر میں ان کے پاس جاؤ گے۔ یہ جان کر انھیں بڑی حیرت ہوئی کہ میں نے وہاں جانے کے لیے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔

سال کے آخر میں اسکول بند ہونے سے ایک دن پہلے میں ہیڈ ماسٹر کے آفس میں وہ خطوط لینے کے لیے گیا۔

وہ بولے: ''کون سے خطوط؟''

اُن کی میز پر بہت سے خطوط اور کاغذات پڑے ہوئے تھے اور شاید میری بات پر انھیں غصہ آ گیا تھا۔

میں نے وضاحت کی: ''میرے والد کے خطوط، سر۔ جب اُن کا انتقال ہوا تھا اس وقت میں نے آپ کے پاس رکھوا دیے تھے۔''

''تم یقین کے ساتھ کہہ رہے ہو کہ وہ خطوط تم نے مجھے دیے تھے۔ تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے بونڈ۔ انھیں اور زیادہ غصہ آ گیا۔ ''تمھارے والد کے خطوط میں اپنے پاس کیوں رکھوں گا۔''

" مجھے نہیں معلوم سر۔ آپ نے یہ کہا تھا کہ گھر جانے سے پہلے یہ خط مجھ سے لے لینا۔''

''دیکھو! مجھے کوئی خط وغیرہ یاد نہیں ہے اور اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔ اب یہاں سے جاؤ۔ تم ضرور کوئی غلطی کر رہے ہو۔ اگر مجھے وہ خط مل گئے تو میں انھیں تمھیں بھیج دوں گا۔''

اُن کی اِس بدسلوکی کا مطلب تو میں نہیں سمجھ سکا لیکن وہ پہلے آدمی تھے جن کے لیے میرے دل میں نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

ٹرین کے دہرہ دون اسٹیشن پر پہنچتے ہی میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا کہ شاید پلیٹ فارم پر مجھے لینے کے لیے کوئی آیا ہو۔ ہندستان کے دوسرے اسٹیشنوں کی طرح اس

اسٹیشن پر بھی کافی بھیڑ تھی۔ سامان سے لدے ہوئے مسافر، قلیوں کی چیخ و پکار، بھٹکتے ہوئے کتّے اور اسٹیشن ماسٹر۔۔۔ٹرین کے اسٹیشن پر رُکتے ہی شور وغل شروع ہو جاتا ہے اور لوگ اپنے سامان کو ادھر ادھر کھینچنے لگتے ہیں۔ میں اپنا ٹرنک اور اٹیچی لے کر کسی طرح پلیٹ فارم پر آیا اور ٹرنک پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا کہ شاید کوئی مجھے لینے آیا ہو۔

آہستہ آہستہ بھیڑ چھٹ گئی۔ اسٹیشن پر ایک بوڑھا سا قلی رہ گیا تھا۔ وہ اتنا کمزور تھا کہ بھاری سامان اٹھانے کے لائق نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ کیا اس کے کندھے ٹریک کا وزن برداشت کر سکتے ہیں۔ دس منٹ انتظار کرنے کے بعد بھی جب میری ماں اور سوتیلے باپ کی طرف سے مجھے کوئی لینے نہیں آیا تو میں نے قلی سے کہا کہ مجھے اسٹیشن سے باہر تانگہ اسٹینڈ تک پہنچا دو۔

ان دنوں سب ہی لوگ یہاں تک کہ بڑے بڑے افسر بھی تانگے سے سفر کرتے تھے۔ دہرہ دون میں صرف ایک ہی ٹیکسی تھی۔

میں تانگا چلانے والے کے، جو پان کھائے ہوئے تھا اور تھوکتا ہوا چل رہا تھا اور جس کے میلے کپڑوں سے بدبو آ رہی تھی، پاس بیٹھ کر بہت خوش ہو رہا تھا اور درختوں کے سائے میں ٹک ٹک کرتا ہوا چھوٹا گھوڑا سڑک سے گزر رہا تھا۔

دہرہ دون ہمیشہ سے اچھے قسم کے پیڑوں کے لیے مشہور ہے۔ اس وادی کی مٹی بھی بہت زرخیز ہے۔ وہاں پر ہر قسم کی چیزیں اگائی جا سکتی ہیں۔ سڑکوں کے کنارے نیم، آم، سفیدہ Amaltas, Jacaranda, Persian Lilac اور بہت سے دوسری قسم کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ لوگوں کے بنگلوں کے باغیچوں میں عام طور پر آم، لیچی، امرود اور کہیں کہیں شریفہ اور پپیتے کے درخت بھی لگے ہوتے ہیں۔ مجھے ایک ساتھ ان درختوں کے بارے میں پتہ نہیں چلا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ پتہ چلتا گیا۔

میں پہلے تانگہ سے اپنی نانی کے گھر پہنچا۔ مجھے ایسا خیال تھا کہ شاید ماں ابھی انھیں کے گھر پر رہتی ہیں۔

پرانی وضع کا بنا ہوا ایک شاندار بنگلہ جس کے چاروں جانب اچھا گراؤنڈ تھا۔ چمنی

سے نکلتے ہوئے دھوئیں کو دیکھ کر مجھے اپنے نانا کے پائپ سے نکلتا ہوا دھواں یاد آ گیا۔ اُس وقت میری عمر آٹھ سال تھی۔ میں نے اپنی زندگی کے بہت سے سال ننھیال میں گزارے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وقت گزر گیا۔ نانا انتقال کر گئے اور اب نانی تنہا یہاں رہتی ہیں۔ ان کے سفید بال، کشادہ پیشانی، پہلے کی طرح چہرے پر وہی وجاہت تھی۔ مجھے تانگے سے اترتا ہوا دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

انھوں نے مجھ سے پوچھا: ''تمھیں کوئی اسٹیشن پر لینے نہیں پہنچا۔'' میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ میری نانی نے کہا: ''تمھاری ماں تو اب یہاں نہیں رہیں۔ تم یہاں پر اس کا تھوڑی دیر انتظار کر لو لیکن وہ تمھارے لیے فکر مند ہوگی۔ چلو میں تمھیں اس کے گھر ہی لے چلتی ہوں۔ آؤ تانگہ پر چڑھنے میں ذرا میری مدد کرو۔ یہ سفید گھوڑا ہے اور سفید گھوڑے کے پیچھے بیٹھنے سے میرا جی گھبراتا ہے۔''

''کیوں، نانی ماں!''

''پتہ نہیں کیوں! سفید گھوڑے پر سفر کرنے سے میرا جی گھبرانے لگتا ہے۔ وہ ہمیشہ چلنے میں ڈگمگاتے ہیں۔''

''ارے ڈرائیور، ذرا آہستہ چلو!'' تانگے والے نے چابک ہلائی اور گھوڑے کی چال دھیمی ہوگئی۔

میرے سوتیلے والد کا گھر دالان والا علاقے میں رسپانا ندی کے خشک حصہ کے قریب تھا۔ وہاں پہنچنے میں پچیس منٹ لگ گئے۔ میری نانی محسوس کر رہی تھیں کہ مجھے ان کی اخلاقی مدد کی ضرورت تھی۔ وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ تانگہ والے نے بستر اور ٹریک وغیرہ ورانڈے میں لا کر رکھ دیا۔ سامنے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ ہم نے کئی بار دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر کے بعد منہ بگاڑتا ہوا ایک نوکر باہر آیا۔ شاید وہ ہمیں دیکھ کر کچھ پریشانی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے میری نانی کو دیکھ کر سلام کیا اور پھر میری طرف گھورنے لگا۔

میری نانی نے پوچھا۔ ''میم صاحب کہاں ہیں؟''

نوکر نے کہا۔ ''وہ باہر گئی ہوئی ہیں۔''

''صاحب کہاں ہیں؟''

''وہ گئے ہوئے ہیں لیکن وہ اس وقت کہاں ہیں مجھے نہیں معلوم۔'' نوکر نے مزید بتایا۔

''مالکن کل شکار کھیلنے موتی چور گئی تھیں اور آج شام تک واپس آ جائیں گی۔'' نانی نے مایوس کن لہجہ میں نوکر سے کہا کہ ''کیا انھیں اپنے بیٹے کے آنے کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔''

''جی، معلوم تھا۔'' اُس نے میری طرف دوبارہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''انھوں نے کہا تھا کہ وہ کل پہنچے گا۔''

''وہ شاید اس کے آنے کی تاریخ بھول گئے۔'' نانی نے غصہ میں کہا۔ ''چلو منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو۔'' نوکر کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا: ''لنچ کا کچھ انتظام ہے؟''

''میں لنچ تیار کیے دیتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ وہ بڑی بے چین نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک لمبا چوڑا موٹی مونچھ والا آدمی تھا۔ اس کے بائیں گال پر ایک گہرا داغ تھا جس سے اس کا چہرہ بہت بدنما لگ رہا تھا۔ وہ ایک پھٹی ہوئی قمیص اور میلا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے بڑے بڑے بھیگے ہوئے پیر تھے۔ اس کے چلنے سے پیروں کے نشان فرش پر پڑ رہے تھے۔

برابر کے کمرے سے ایک بچے کے رونے کی آواز سنائی دی اور ایک عورت (جو باورچی کی بیوی تھی) بچے کو ہاتھوں میں ہلاتی ہوئی باہر آئی۔

''وہ لوگ بچے کو بھی اکیلا چھوڑ گئے۔'' نانی کو اور زیادہ غصہ آ گیا۔ ''یہ تمھارا چھوٹا بھائی ہے۔ صرف چھ ماہ کا ہے۔''

مجھے چھوٹے بھائی کے بارے میں تو کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔ میرے لیے یہ خبر بالکل نئی تھی، اس لیے میں ذہنی طور پر بچے کے بارے میں تیار بھی نہیں تھا۔ بہر حال وہ میرا آدھا بھائی تو تھا ہی۔ میں نے بغیر کسی محبت اور جذبے کے اس کو دیکھا۔ وہ ایک صحت مند بچہ تھا

اورغوں غا کر رہا تھا۔

نانی نے کہا۔ ''بچہ خوبصورت ہے۔'' اور مجھ سے بولیں۔

''ٹھیک ہے۔ اب میں چلتی ہوں مجھے کچھ کام کرنا ہے۔ یہ نوکر تمھاری دیکھ بھال کرے گا۔ دو ایک دن میں تم مجھ سے ملنے آجانا۔ پچھلے سال کے مقابلے میں اب تم بڑے ہو گئے ہو اور مہاسے بھی نکل آئے ہیں۔'' انھوں نے میرے مہاسوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس سے مجھے خوشی ہوئی، کیونکہ میری نانی نے پہلے کبھی میری ایسی ناز برداری نہیں کی تھی۔ اب ایسا لگا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہیں۔

انھوں نے کہا: ''تانگے والا میرا انتظار کر رہا ہے اور میں اس تانگے سے واپس چلی جاتی ہوں کیونکہ جب بھی ضرورت ہوتی ہے تب تانگے والا نہیں ملتا اور ملتا بھی ہے تو سفید گھوڑے والا۔۔۔ اور جب تمھاری ماں واپس آئے تو اس سے کہنا کہ میں تمھارا شکار دیکھنا چاہتی ہوں۔ دراصل تمھارا کام بچے کی دیکھ بھال کرنا ہے اور تم شکار پر چلی گئیں۔''

نانی اچھی طرح تانگے میں بیٹھ گئیں اور انھوں نے سر ہلا کر نوکر کے سلام کا جواب دیا اور سیٹ کے ہتھوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ تانگہ والے کے چابک کو ہوا میں لہراتے ہی گھوڑا قابو سے باہر ہو گیا اور ٹک ٹک کرتا ہوا چل پڑا۔ میری نانی کو محسوس ہو رہا تھا کہ یہ سفید گھوڑا ضرور آج اُن کی جان لے کر چھوڑے گا۔ انھوں نے اپنے دانت بھینچ لیے تھے اور مضبوطی سے تانگے کی سیٹ کو پکڑے ہوئے تھیں۔ انھیں جاتا ہوا دیکھ کر مجھے دکھ محسوس ہو رہا تھا۔

شام کو میری ماں اور سوتیلے باپ شکار سے واپس آئے۔ ان کے ہاتھوں میں چکور تھی جو انھوں نے باورچی کے ہاتھ میں تھما دی، جس کا نام منگل سنگھ تھا۔ میری ماں نے برائے نام مجھے پیار کیا۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوں گی۔ مجھے اپنے موجودہ باپ سے مل کر اجنبیت کا احساس ہوا۔ اس وقت مجھے اپنے اصل والد کی بہت کمی محسوس ہوئی۔ بورڈنگ اسکول تو زندگی کا معمول بن گیا تھا۔ گھر جاتے وقت میں اپنی ترقی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لیکن میرے گھر جانے کا مقصد صرف اپنے والد سے ملنا ہوتا تھا۔

اب تو وہ بھی نہیں رہے اور میں بدنصیب باقی رہ گیا ہوں۔

دو انسان جو ایک دوسرے بے حد محبت کرتے ہوں ان میں سے کسی ایک کی موت ہو جائے اور دوسرا اُسے اپنے ہاتھوں سے دفن کرے تو اس کی پریشان کن کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن جب آپ کسی کے باپ کی موت کی خبر سنیں اور اس موت کی خبر بھی ایک مخصوص انداز میں اُس کے کم سن بیٹے کو ملی ہو اور ایسی موت جس کا کوئی ثبوت بھی موجود نہ ہو، ایسا ہی کچھ حادثہ میرے ساتھ پیش آیا۔ یہ موت کی خبر نہیں تھی بلکہ اُن کے لاپتہ ہونے کی خبر تھی۔ جب بھی میں انھیں ہنستا، بولتا اور مسکراتا ہوا تصور کرتا ہوں تو مجھے اُن کی موت کا یقین ہی نہیں آتا۔ ضرورت پڑنے پر جب بھی میں انھیں بلاتا تھا وہ فوراً آجاتے تھے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ اب بھی میرے بلانے پر چلے آئیں گے۔ آج میں ان کے بغیر اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کر رہا ہوں۔

میرے سوتیلے باپ نے میری طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ گھر میں گھستے ہی وہ سوڈا اور شراب میں مصروف ہو گئے اور میری ماں بھی بچہ کی طرف متوجہ ہو گئیں اور میں اپنے کھلے ہوئے سامان کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔

خوش قسمتی سے اس گھر میں میرا ایک کمرہ تھا۔ میں تنہائی پسند واقع ہوا تھا۔ میرے سوتیلے ماں باپ کو بھی تنہائی پسند تھی۔ میرے سوتیلے باپ مقامی طور پر کچھ تجارت کرتے تھے اور وہ مجھے اپنے ساتھ اس شرط پر رکھنے کے لیے تیار ہو گئے تھے کہ میں ان کی ذاتی زندگی میں دخل نہیں دوں گا۔ اس کے برخلاف میں بھی اس شرط پر ان کے ساتھ رہنے کے لیے تیار تھا کہ وہ مجھے تنہا چھوڑ دیں گے اور آخر تک میں اپنی ماں سے یہی ضد کرتا رہا کہ وہ مجھے سب سے الگ تنہا چھوڑ دیں۔

میں اپنے کمرے کی بڑی کھڑکی کو شام کے وقت کھول دیتا اور باغیچہ کا نظارہ کرتا رہتا تھا۔ وہاں بہت سا کوڑا کرکٹ جمع رہتا تھا اور لیچی کے پیڑ کے چاروں طرف سورج مکھی کے علاوہ کچھ نیلے پیلے رنگ کے جنگلی پھول بھی ہمیشہ دکھائی دیتے رہتے تھے۔

●●●

خواہش

ایک بوڑھا فقیر جس کی جھکی ہوئی کمر، لہراتی ہوئی سفید داڑھی اور پر تجسس آنکھیں تھیں، سڑک کے دوسرے جانب باغیچے کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور میری طرف دیکھنے لگا میں لیچی کے پیڑ کی شاخ کو پکڑے ہوئے کھڑا تھا۔

''تمھاری کیا خواہش ہے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

سڑک کے اس پار کھڑے ہوئے اس بوڑھے فقیر نے بڑا عجیب سوال کیا۔

اور اس نے سوال بھی انگریزی میں کیا جب کہ ان دنوں انگریزی بولنے والے فقیر بہت کم پائے جاتے تھے۔

''تمھاری کیا خواہش ہے؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

مجھے یاد نہیں میں نے کیا کہا۔

شاید میں نے گزشتہ رات کوئی خواب دیکھا تھا۔

جو تم سمجھ رہے ہو میرا وہ مطلب نہیں ہے۔

میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم صرف خواب ہی دیکھتے ہو۔

یہ لیچی کا موسم نہیں ہے پھر بھی تم ہر سہ پہر کو یہاں بیٹھ کر خواب دیکھتے رہتے ہو۔

مجھے یہاں بیٹھنا اچھا لگتا ہے مگر میں خواب نہیں دیکھتا۔

دوسرے لڑکوں کی بھی کوئی خواہش نہیں ہے۔ وہ تو صرف تتلیوں کے ساتھ کھیلتے

رہتے ہیں۔

''لڑکے۔ زندگی میں زیادہ سے زیادہ پانے کی خواہش ہے تمھیں!''

''ہاں۔'' اس نے کہا۔ ''میرا ایک کمرہ ہے۔''

''اوہ۔ تمھارا اپنا ایک کمرہ، تمھارا اپنا ایک درخت، بہت سے لوگوں کے پاس تو اپنا کمرہ تک نہیں ہے۔''

''بتاؤ ان دنوں تم کس طرح کے کمرے میں رہتے ہو؟''

''یہ ایک بڑا کمرہ ہے لیکن اس میں میرا بھائی، میری بہن اور کبھی کبھی میری آنٹی بھی آ کر رہتی ہیں۔''

''میں سمجھ گیا تم آزادی چاہتے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ تمھارا اپنا کمرہ، اپنا درخت سورج کی روشنی میں اپنی جگہ ہو۔''

''ہاں۔ بالکل یہی بات ہے۔''

''بس یہی مسئلہ ہے اور جب تمھیں یہ سب کچھ مل جائے گا تو تمھاری خواہش پوری ہو جائے گی۔''

''بتاؤ کس طرح تم یہ سب کچھ حاصل کرو گے۔ میرے دوست یہ کوئی جادوئی چیز نہیں ہے۔ میں اگر خدا کا نیک بندہ ہوتا تو تمھارے ساتھ اپنا وقت ضائع نہ کرتا۔ تمھیں اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے جٹ جانا چاہیے اور جو رکاوٹ تمھارے راستے میں آئے اسے ہٹا دو۔ لیکن آزادی حاصل کرنے کے لیے اس سب کچھ کے حصول کی بہت جلدی امید نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے لیے بہت سی مشکلوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔''

''اس کے بعد!''

''ہاں۔ کیوں کہ یہ سب کچھ بہت آسانی سے کھو بھی سکتا ہے اور کوئی تم سے چھین بھی سکتا ہے۔ یا تم لالچی اور لاپروا ہو جاؤ گے اور اچانک تمھارا خواب چکنا چور ہو جائے گا۔''

''میں نے پوچھا۔ تم یہ سب کچھ کیسے جانتے ہو؟''

''کیوں کہ میرا بھی ایک خواب تھا جو پورا نہ ہو سکا۔''

''کیا تمھارا سب کچھ ختم ہو گیا؟''

''ذرا میری طرف دیکھو! میرے دوست کیا میں تمھیں کوئی راجا یا خدا کا نیک بندہ لگتا ہوں؟ میری خواہش کے مطابق میرے پاس ہر چیز موجود تھی لیکن میری خواہش بڑھتی گئی.....ایک گھر ملنے کے بعد تمھیں ایک بلڈنگ کی خواہش ہوگی۔ بلڈنگ حاصل کرنے کے بعد تم ایک علاقہ کی خواہش کرو گے اور علاقہ پانے کے بعد تم اپنی ایک سلطنت چاہو گے لیکن یہ سب پانا بہت مشکل ہوگا۔''

''کیا تمھاری کوئی سلطنت تھی؟''

''کچھ اسی طرح.....لڑکے دوسرے کے خوابوں کو نہ اپناؤ اپنے خوابوں پر چلو۔ دوسروں کے راستوں پر نہ چلو۔ دوسرے کے عزائم، اس کا گھر اور اس کے گیتوں کو نہ اپناؤ۔ اور وہ شاعری کی طرف رجوع ہوا اور خوش الحان لہجے میں دو مصرعے پڑھے جو میں نے شاید کبھی نہیں سنے تھے۔ وہ یقیناً اس کے اپنے تھے۔

''جگ جگ جیو میرے دوست خدا تمھیں ہمت اور طاقت عطا کرے لیکن کبھی کسی کی خوشی کو اس سے نہ چھیننا۔''

میں لیچی کے درخت کے پاس کھڑا ہوا اس کی ذہانت پر غور کرتا رہا۔ مجھے تعجب تھا کہ اتنا عقلمند آدمی بھی کیا اتنا غریب ہوسکتا ہے۔ شاید اس کے بعد ہی وہ اتنا عقلمند ہوا ہو۔ بہرحال وہ چلا گیا اور میں بھی اپنے گھر لوٹ آیا۔ مجھے ایک کمرے کی خواہش تھی جو مل گیا۔

میں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ آزادی ایک ایسی چیز ہے جسے بنائے رکھنے کے لیے بہت چوکس رہنا پڑتا ہے۔

●●●

تانگے کا آخری سفر

دہرہ دون میں یہ بہار کا موسم تھا اور بنگلے کی دیوار میں پھولوں سے لدی بڑی بڑی شاخوں سے گھری ہوئی تھیں۔ پپیتے پک چکے تھے اور پھولوں کی بھینی مہک باغ کے باہر تک پھیلی ہوئی تھی۔ دادی ماں برآمدے کے ایک کونے میں آرام کرسی پر بیٹھی تھیں اور سلائیوں سے بنتے ہوئے اُن کا سر اِدھر اُدھر حرکت کر رہا تھا۔ وہ میرے والد کے لیے بڑا سوئیٹر تیار کر رہی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ دہلی میں بہت سردی ہوتی ہے۔ سردی کا موسم شروع ہونے سے آٹھ ماہ قبل ہی انھوں نے ہمارے لیے گرم کپڑوں کی تیاری شروع کر دی تھی۔

کاٹھیاواڑ بحرِعرب کے ساحل پر واقع تھا اور اس کے گرم پانی کی وجہ سے وہاں زیادہ سردی نہیں ہوتی تھی لیکن دہرہ دون ہمالیہ کے پہلے ہی سلسلہ کے دامن پر واقع ہونے کی وجہ سے ٹھنڈا تھا۔

دادی ماں کے بال سفید ہو چکے تھے۔ ان کی بینائی بھی کمزور تھی لیکن ان کی انگلیاں سوئیٹر بننے والی سلائیوں پر بہت تیزی سے چلتی تھیں اور صبح سویرے ہی سے وہ اس کام میں لگ جاتی تھیں۔

دادی ماں کی نظر بچتے ہی میں Geranium کے پتوں کو اپنی انگلیوں سے مسلا تا اور ناک پر رکھ کر دبا دیتا۔

میں تقریباً ایک ماہ سے اپنی دادی کے پاس دہرہ دون میں رور ہا تھا لیکن اس دوران میں نے اپنے والد کو وہاں نہیں دیکھا۔ اس سے پہلے کبھی ہم اتنے لمبے عرصہ کے لیے ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوئے تھے۔ ہر ہفتہ وہ مجھے کتابیں، تصویریں اور پوسٹ کارڈ وغیرہ بھیجا کرتے تھے اور میں پوسٹ مین کی تلاش میں سڑک پر دور تک چلا جاتا کہ شاید کوئی خط میرے لیے اس کے پاس ہو۔

دروازے پر تانگے کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دی اور جانی پہچانی گھوڑا گاڑی کھٹ کھٹ کرتی ہوئی دروازے پر آ پہنچی۔

''میں دیکھتا ہوں کون ہے۔'' یہ کہتا ہوا میں برآمدے کی سیڑھیوں سے ہوتا ہوا باغیچہ میں پہنچا۔

وہ بنسی کا تانگہ تھا۔ یوں تو دہرہ دون میں بہت سے تانگے اور تانگا چلانے والے تھے لیکن بنسی میرا پسندیدہ تانگے والا تھا۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان تھا اور ہمیشہ صاف ستھری قمیض اور پاجامہ پہنتا تھا۔ اس کا گھوڑا دوسرے تانگے والوں سے زیادہ صحت مند اور تیز رفتار تھا۔

بنسی کے تانگے میں کوئی سواری بیٹھی ہوئی نہیں تھی اس لیے میں نے اس سے پوچھا:

''بنسی تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

''دوست، تمھاری دادی نے مجھے بلایا ہے۔'' وہ مجھے چھوٹے صاحب یا بابو نہیں کہتا تھا بلکہ دوست کہہ کر پکارتا تھا۔ یہ لفظ میرے لیے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ مجھے تانگے والے کی دوستی پر فخر تھا۔

میں برآمدے سے دوڑتا ہوا آیا اور دادی ماں سے پوچھا: ''آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

''میں بینک جا رہی ہوں۔''

''کیا میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں؟''

''کس لیے؟ تم بینک جا کر کیا کرو گے؟''

''میں اندر نہیں جاؤں گا۔ میں بنسی کے ساتھ تانگے میں ہی بیٹھا رہوں گا۔''

''اچھا ٹھیک ہے، آ جاؤ۔''

ہم نے دادی ماں کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے میں مدد کی اور میں بنسی کے پاس ہی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے گھوڑے سے کچھ کہا اور گھوڑا ایک جھٹکے کے ساتھ دروازے سے نکل کر تیزی سے سڑک پر آ گیا۔

''بنسی ذرا آہستہ چلو۔'' دادی ماں نے کہا۔ انھیں تانگا، موٹر کار یا بیل گاڑی وغیرہ ایسی کوئی بھی تیز رفتار چیز پسند نہیں تھی۔

بنسی نے جواب دیا۔ ''میم صاحب تیز رفتاری سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ گھوڑا تو اپنی زندگی میں بھی تیز چلا ہی نہیں ہے۔ اگر ہمارے پیچھے بم بھی پھٹ رہا ہو تب بھی یہ تیز نہیں دوڑ پائے گا۔ میرے پاس ایک تیز رفتار گھوڑا بھی ہے جس کو میں اس وقت استعمال کرتا ہوں جب سواری بہت جلدی میں ہوتی ہے۔ میم صاحب میں گھوڑا صرف آپ کے لیے ہے۔''

دادی ماں کو دوسرے گھوڑے کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔

دس منٹ سفر کرنے کے بعد ہم بازار میں الٰہ آباد بینک پہنچ گئے جہاں دادی ماں کو جانا تھا۔ دادی ماں بینک میں چلی گئی اور ہم گھنٹہ گھر کے پاس کھڑے ہو گئے۔ دادی ماں کو تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد واپس آنا تھا، اس لیے میں اور بنسی دُکانوں کے سامنے گھومنے لگے۔ گھوڑے کے کھانے کے لیے کچھ چارہ چھوڑ دیا تھا۔

''تمھارے پاس کچھ پیسے ہیں؟'' بنسی نے پوچھا۔

''چار آنے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''دو کپ چائے کے لیے بہت ہیں۔'' بنسی نے کہا۔

وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چائے کی دُکان کی طرف چل پڑا اور میں نے پیسے اُس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

میں نے اس سے کہا: ''اگر تم چائے پسند کرتے ہو تو پی سکتے ہو۔ لیکن میں لیمو پانی پیوں گا۔''

''ٹھیک ہے دوست ایک چائے اور ایک لیمو پانی۔''

بنسی نے چائے والے کے نوکر سے کہا: ''ہمارے لیے پہلے پانی لے کر آؤ۔'' پانی پیتے ہوئے بنسی نے گھوڑے کی طرح آواز نکالی اور میں اس جگہ کی ہریالی سے لطف اندوز ہوتا رہا جو لیمو پانی سے کئی گنا زیادہ مزیدار تھی۔

دادی ماں جب بینک سے باہر آئیں تو وہ شاید کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ انھوں نے زیادہ بات چیت بھی نہیں کی اور گھر واپس آتے ہوئے انھوں نے مجھ سے صرف اتنا کہا کہ تہذیب کے دائرے میں رہو، کیونکہ میں گھوڑے کے ساتھ کھلواڑ کر رہا تھا۔ بنسی کو پیسے دے کر وہ سیدھی گھر کے اندر چلی گئیں۔

میں نے بنسی سے پوچھا: ''تم پھر کب آؤ گے؟''

''دوست، جب بھی میری خدمت کی ضرورت پیش آئے گی، میں آ جاؤں گا۔ تم جانتے ہو کہ میں اپنی روزی روٹی کمانے میں لگا رہتا ہوں۔ بہرحال ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ آئندہ جب بھی میں کسی سواری کو چھوڑ کر یہاں سے گزروں گا، دروازے پر تانگے کے گھنگرو بجا کر تمھیں ضرور اطلاع کر دوں گا اور اگر تمھارے پاس خالی وقت ہوا تو بغیر کسی معاوضہ کے تم میرے ساتھ تانگہ پر سواری کر سکتے ہو۔ تمھیں صرف ایک کپ چائے کے پیسے ہی اپنے ساتھ لانے ہوں گے۔''

''بالکل ٹھیک۔ بہرحال ہم دونوں دوست ہیں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''ہاں ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔''

اور اُس نے چابک سے گھوڑے کو بہت آہستہ سے چھوا اور تانگہ کھڑکھڑاتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ بنسی کی آواز گھوڑے کی چال کے ساتھ ساتھ نکل رہی تھی۔

'آیا' بیڈروم میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ اس کے پھیلے ہوئے کولہوں پر رکھے ہوئے تھے۔ یہ ایک طوفان کی علامت تھی۔

''تم مجھے بتائے بغیر اس طرح بازار کیسے چلے گئے؟'' اس نے غصہ سے کہا۔ (کیا دادی ماں سے اجازت لینا کافی نہیں ہے)۔ ''میں اُس وقت سے تمھیں نہلانے کے

لیے انتظار کر رہی ہوں۔''

''اب تو بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب نہیں!'' میں نے پرامید ہو کر کہا۔

''نہیں بالکل نہیں۔ لنچ میں ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے۔ تم اپنے کپڑے اتار دو۔''

کپڑے اتارتے وقت آیا نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ ''بنسی تانگہ والے کے ساتھ مت رہا کرو۔'' میں نے سوچا کہ شاید اسے کچھ حسد پیدا ہو گئی ہے۔

''وہ ایک دھوکہ باز، شرابی، جواری آدمی ہے اور چرس وغیرہ بھی پیتا ہے۔ ٹی۔ بی کے علاوہ اُسے کئی اور بھی خطرناک بیماریاں ہیں۔ اس طرح کے لوگوں سے دوستی نہیں کرنا چاہیے۔ بابا سمجھ گئے نا؟'' میں نے ہاں میں اپنا سر ہلایا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ میں نے سوچا کہ یہ ہمیشہ لوگوں کے بارے میں ایسے ہی کہتی رہتی ہے اور میرا تانگہ پر بغیر کچھ دیے سواری کرنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔

میرے والد بتایا کرتے تھے کہ دہرہ دون میں بہت اچھے اچھے درخت ہیں۔ دادی ماں کے گھر کے چاروں طرف نیم، آم، شریفے، پیتے اور پرانے پیپل کے درخت ہیں۔ ان میں سے کچھ درخت میرے دادا اور دادی نے لگائے تھے۔

میں نے دادی ماں سے پوچھا: ''شریفے کا پیڑ کتنا پرانا ہے؟''

''مجھے سوچنے دو۔'' دادی ماں نے کہا اور شریفہ کے درخت کو بہت غور سے دیکھنے کے بعد انھیں یاد آیا۔ ''ہاں یہ درخت تمھارے دادا نے 1927 میں لگایا تھا۔ بارش ہو رہی تھی اور 14 جولائی 1927 کو ہم نے تمھارے والد کا جنم دن پیڑ لگا کر منایا تھا۔ تمھاری پیدائش سے بہت پہلے کی بات ہے۔''

ہمارے گھر کے پیچھے جو برگد کا پیڑ اُگا ہوا ہے، اس کی شاخیں پھیل کر زمین تک پہنچ گئی ہیں اور ان شاخوں نے دوبارہ زمین میں جڑ پکڑ لی ہے اور لہراتے ہوئے راستوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ان کے درمیان مجھے گھومنا بہت اچھا لگتا ہے۔ یہ درخت اس گھر سے اور ہمارے آباواجداد سے بھی پرانا ہے۔ اتنا پرانا جتنا دہرہ دون۔ میں اس درخت کی

ہری اور گھٹی پتیوں کے پیچھے چھپ کر دنیا کا نظارہ کر سکتا ہوں۔

تقریباً ساٹھ فٹ لمبے اس بلند و بالا درخت کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ کیونکہ میں نے اتنا بڑا درخت اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں آہستہ آہستہ بڑی احتیاط کے ساتھ اُس کی طرف بڑھا مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ درخت میری دوستی قبول کرے گا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس میں بہت سے راز پوشیدہ ہیں۔ اس کی شاخوں سے حرکات وسکنات کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن یہ آوازیں کہاں سے اور کس طرح آ رہی تھیں اس کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔

درخت سے ایک پتّا گرا جو دوستی کی ابتدا کی علامت تھا۔

وہ پتّا میرے چہرے سے رگڑ کھاتا ہوا زمین پر گرتا اس سے پہلے ہی میں نے اسے پکڑ لیا۔ میں نے اپنی انگلیوں اور گھومتے ہوئے چمکدار اور چکنے پتّے کو غور سے دیکھا اور اپنے ہاتھ سے پیڑ کی کھردری چھال کو چھوا تو بہت اچھا لگا۔ پھر میں نے پیڑ پر چڑھنے کے لیے اس طرح جوتے اور موزے اتارے جیسے کسی مقدس جگہ میں داخل ہوتے وقت اُتارے جاتے ہیں۔ اس پھیلے ہوئے پیڑ کے تنے پر پہلے میں نے اپنا پیر جمایا اس کے بعد اُسے ہاتھ سے پکڑ لیا اور پھر میں نے اوپر تک پھیلی ہوئی پیڑ کی جڑوں کی مدد سے اوپر کی طرف چڑھنے کی کوشش کی۔

مجھے محسوس ہوا کہ پیڑ پر چڑھنے میں کوئی ہاتھ میری مدد کر رہا ہے لیکن کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پیڑ میں کوئی روحانی ہاتھ ہے جس نے مجھے ہوا اور اوپر چڑھنے میں میری مدد کی۔

پیڑ سے مجھے اپنائیت کا احساس ہوتا تھا لیکن کچھ ایسی بھی چیزیں تھیں جنھیں میرے وہاں آنے پر پریشانی ہوئی۔ پیڑ کے سوراخ سے طوطے کا ایک جوڑا چہچہاتا ہوا باغ سے باہر نکل گیا جس کو دیکھ کر لال، ہرے اور سنہری جیسے شوخ رنگ دکھائی دیے۔ ایک گلہری نے پیر کی شاخ کے پیچھے سے مجھے دیکھا اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے رینگتی ہوئی اپنے ساتھیوں کو بتانے واپس چلی گئی۔ میں پیر کے اوپر کی طرف بڑھا۔ میرے سر کے

ٹھیک اوپر ایک چڑیا کی سرخی مائل چونچ نظر آئی لیکن اس نے مجھ پر حملہ نہیں کیا۔ وہ اس پیڑ کے تنے کے ایک بڑے سوراخ میں آرام کر رہی تھی۔ اس سوراخ سے چڑیا کی لمبی چونچ اور سر دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے بڑی بوریت کے انداز میں میری طرف دیکھا۔ وہ کبھی آنکھیں کھولتی اور پھر بند کر لیتی، اس طرح وہ اونگھ رہی تھی۔ میں نے خود سے کہا: ''یہاں تو بہت سے کیڑے مکوڑے رہتے ہیں لیکن وہ خطرناک نہیں ہیں۔''

اسی لمحہ ایک جھینگر وہاں سے گزرا جس سے چڑیا پھڑ پھڑانے لگی۔ چونچ اور پر کا تنا زور سے ٹکرائے جس سے ٹک کی آواز نکلی۔

میں گھبراہٹ میں گر جاتا لیکن اس مضبوط پیڑ سے گرنا آسان نہیں تھا کیونکہ اس میں جگہ جگہ رکنے اور لیٹنے کی بھی جگہیں تھیں۔ میں اس شاخ کی مدد سے رینگتا ہوا سوراخ سے آگے بڑھ گیا اور پیڑ کا خاص حصہ جو گھنا اور ٹھنڈا تھا آہستہ آہستہ اس سے آگے بڑھ کر اس جگہ پہنچ گیا جہاں سورج کی کرنیں پتوں سے چھن کر نیچے آ رہی تھیں۔

میں پھیلی ہوئی شاخوں کے پتّوں کی چادر کے پیچھے چھپ کر سیدھا لیٹ گیا۔ وہاں سے مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک صاحب کیپ لگائے ہوئے تھے اور اُن کے ساتھ اُن کی بیوی ایک شوخ چھتری کو تیزی سے گھماتی ہوئی دکھائی دیں۔ بظاہر چھتری لگانے کا مقصد واضح تھا کہ کہیں اُن کا رنگ کالا نہ پڑ جائے اور وہ غلطی سے غیر ملکی دکھائی نہ دینے لگیں۔ ان کے پیچھے ایک بچہ گاڑی اور نوکرانی تھی۔

اس کے علاوہ بہت سے ہندوستانی بھی دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ دھوتی پہنے تھے اور کچھ لنگوٹی اور کچھ یورپی لباس میں ملبوس تھے اور کچھ لوگوں کا سامان قلی اٹھائے ہوئے تھے۔

سڑک پر اچانک دھول مٹّی اور ہارن کی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی بے قابو اژدہا آ رہا ہو لیکن وہ مارِس کی نئی ماڈل کی ٹو رنگ کار تھی۔ اس کے پیچھے سائیکل سوار، اُس کے بعد پیتے والا اپنے سر پر ٹوکری لیے ہوئے تھا، پھر تماشا دکھانے والا دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں ایک ڈھول تھا۔ تماشا دکھانے والے کے ساتھ ایک بندر تھا اور بہت سے بچے اس

کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ یہ بندر جھلملاتے ہوئے کپڑے اور بچے کی طرح ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ کھڑکھڑاتا ہوا بنسی کا تانگہ روڈ پر آتا دکھائی دیا۔ میں نے اسے آواز دی اور وہ حیرت سے اوپر برگد کے پیڑ کی شاخوں کی طرف دیکھنے لگا۔

''اوپر تم کیا کر رہے ہو؟'' بنسی نے چلّا کر پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔ ''دادی ماں سے چھپ کر یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔''

''اور تانگے کی سواری کب کرو گے؟''

میں نے جواباً کہا۔ ''منگل کے دن دوپہر کے بعد۔''

''آج کیوں نہیں؟''

''آیا آج مجھے نہیں چھوڑے گی اور منگل کے دن اس کی چھٹی ہوتی ہے۔''

بنسی نے پان کی پیک سڑک پر تھوکتے ہوئے کہا۔ ''آیا تو تم سے جلتی ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' میں نے جواب میں کہا۔ ''عورتیں ہمیشہ جلتی ہیں، شاید اس لیے کہ اس کے پاس تانگہ نہیں ہے۔''

بنسی نے بڑی بدمزاجی سے کہا: ''اس لیے کہ آیا کے پاس اچھا تانگہ چلانے والا بھی نہیں ہے۔ تم فکر مت کرو۔ میں منگل کے دن یعنی پرسوں آؤں گا۔ بس کل ہی کی تو بات ہے۔''

میں نے بنسی کو سر ہلاتے ہوئے اشارہ کیا اور اُسی شاخ پر واپس چلا گیا کیونکہ کچھ فاصلے پر آیا کی آواز سنائی دی تھی۔ بنسی نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور چٹاخ کی آواز کرتے ہوئے تانگے کو تیزی سے بھگا لے گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب میں گھر آیا تو آیا نے پوچھا: ''تم اوپر کیا کر رہے تھے؟'' میں نے جواب میں بتایا کہ سڑک کے دوسری طرف سانپ دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس بات پر زیادہ بحث نہیں کرے گی۔ اُسے اس بات پر تعجب ہوگا کہ میں نے صرف ایک سانپ دیکھا کیونکہ کاٹھیاواڑ میں دہرہ دون سے زیادہ سانپ پائے جاتے ہیں۔

اس نے پوچھا: ''وہ تمھارے قریب آ رہا تھا یا واپس جا رہا تھا۔''

''وہ واپس جا رہا تھا۔''

یہ سن کر آیا کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔

''سانپ کو واپس جاتے ہوئے دیکھنا غریبی کی علامت ہے۔'' اس نے بڑے اُداس لہجہ میں کہا۔

اس نے اچانک میرے پیٹ کی طرف قریب سے دیکھتے ہوئے کہا: ''تم بہت خوش قسمت ہو!''

''کیسے؟'' میں نے اُس سے کہا ''ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ تم غریب ہی رہو گے، کیونکہ تم نے سانپ کو غلط راستہ پر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔''

''نہیں، تم بہت زمانے تک غریب نہیں رہ سکتے کیونکہ تمھارے پیٹ پر ایک تِل ہے جو خوش قسمتی کی علامت ہے۔ ایک تِل تمھارے بازو کے نیچے ہے۔ اس کا مطلب ہے تمھیں بہت شہرت ملے گی۔ کیا تمھاری ناک پر بھی تِل ہے۔ نہیں، خدا کا شکر ہے۔ ناک پر تِل ہونا قاتل ہونے کی علامت ہے۔''

میں نے اس سے پوچھا: ''کیا تمھارے بھی کوئی تِل ہے؟''

آیا نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ سر ہلایا اور کندھے سے آستین کو اوپر کر کے بازو پر ایک بڑا تِل دکھایا۔

''اس کا کیا مطلب ہے؟'' میں نے اُس سے پوچھا۔

آیا نے بڑے مایوس کن لہجہ میں کہا۔ ''اس کا مطلب مصائب و آلام کی زندگی۔''

میں نے اُس سے پوچھا: ''کیا میں اس تِل کو چھو سکتا ہوں؟''

اُس نے کہا: ''ہاں چھو سکتے ہو۔'' اور اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اس تِل پر رکھ دیا۔

''یہ بہت اچھا تِل ہے۔'' میں نے آیا کو خوش کرنے کے لیے کہا۔ ''کیا میں اس کا بوسہ لے سکتا ہوں۔''

آیا نے کہا۔ ''تم اس تل کا بوسہ لے سکتے ہو۔''

میں نے اس تِل کا بوسہ لیا۔

اس نے کہا: ''مجھے بہت اچھا لگا۔''

آخر کار منگل کا دن آ ہی گیا۔ دوپہر کے بعد جیسے ہی دادی ماں سو گئیں اور آیا بازار چلی گئی، میں فوراً دروازے پر آ گیا اور سڑک پر اوپر نیچے بنسی اور اس کے تانگے کا انتظار کرنے لگا۔ اُس نے آنے میں زیادہ دیر نہیں کی۔ تانگہ کے سڑک کی طرف مڑتے ہی میں نے بنسی کے گانے کی آواز سن لی۔ وہ تانگہ کے ساتھ سُر ملا کر گا رہا تھا۔

وہ تانگے سے نیچے اُترا اور میرا ہاتھ پکڑ کر جھکولے دیتا ہوا تانگے کے قریب لے گیا اور اگلی سیٹ پر اپنے پاس مجھے بٹھا لیا۔

سڑک سے نیچے کی طرف اُترتے وقت لڑکھڑاتے ہوئے تانگے کو میں نے مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ جب ہم شہر سے ذرا باہر آئے تو بنسی نے گھوڑے کو ایک مخصوص آواز کے ساتھ اور تیز چلنے کے لیے اُکسایا اور اپنی سیٹ سے اُٹھ کر آگے کی طرف جھکتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر چابک پٹاخ سے مارا۔ اس کے بعد ہم تیز رفتاری سے سڑک کے ایک طرف آ گئے اور سڑک کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ جھٹکا لگنے سے میں بنسی کی بانہوں سے چمٹ گیا۔ بنسی کا منہ پان کی سرخ پیک سے بھرا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

''ہم کہاں جائیں گے، دوست!'' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''کسی بھی جگہ، کہیں بھی۔''

بنسی نے کہا۔ ''ندی پر چلتے ہیں۔''

یہ ندی جو حقیقت میں جھرنے کا ایک خوبصورت پہاڑ دکھائی دیتی ہے، دہرہ دون کے جنگلوں سے گزرتی ہوئی پندرہ کلومیٹر دور جا کر گنگا ندی میں جا ملتی ہے۔ گرمی کی ابتدا اور جاڑے کے موسم میں تو تقریباً خشک ہو جاتی ہے لیکن برسات میں تو اس میں باڑھ آ جاتی ہے۔

دہرہ دون کے باہری علاقے کی صاف ستھری اور ڈھلوان سڑکوں پر ہمارا تانگہ تیز دوڑ رہا تھا۔ راستے میں چائے کے باغات اور سفیدے کے درخت لگے ہوئے تھے۔ گھوڑے کے دھات کے کھر جب سڑک سے ٹکراتے تو چنگاری پیدا ہو جاتی تھی۔ تانگے

کے پہیوں کے چڑ چڑ کی آواز سے مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کوئی پہیہ نکل گیا تو ہم کسی کھڈے میں جا پڑیں گے یا پھر سڑک کے ساتھ بہتی ہوئی نہر میں جا گریں گے۔ ہمارا تانگہ تیزی کے ساتھ آم، امرود، لیچی اور دیگر پھلدار درختوں سے ہو کر گزر رہا تھا۔ سال اور شیشم کے درخت بھی تیزی سے گزرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک بنسی نے تانگہ کو ایک کھردری پگڈنڈی کی طرف موڑ لیا۔ تقریباً ایک فرلانگ تک نیچے کی طرف چلنے کے بعد ہم ایک جھرنے پر پہنچ گئے۔

بنسی نے کہا۔ ''میں، تم اور گھوڑا تینوں ہی چلو سیدھے پانی میں چلتے ہیں۔'' اس نے تانگے کو جھرنے کے بیچ میں لے جا کر کھڑا کر دیا اور گھوڑے کے گھٹنے پانی میں ڈوب گئے۔

''میں بھی نہانے کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں بلکہ گھوڑا بھی نہانا چاہتا ہے۔'' بنسی نے کہا۔ ''مالک کی طرح گھوڑا بھی نہا کر کیوں نہ خوشی محسوس کرے؟'' یہ کہہ کر بنسی نے اپنے کپڑے اُتار کر پھینکے اور پانی میں کود پڑا۔

نل کے مقابلے میں جھرنے پر نہانا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ اُس نے اپنے سینے پر اور پھر ران پر ہاتھ مار کر چلاّتے ہوئے کہا ''آؤ دوست تم بھی میرے ساتھ آ جاؤ۔''

تھوڑی دیر ہچکچاہٹ کے بعد میں اُس کی طرف چل پڑا لیکن پانی میں پیر رکھتے ہی مجھے ایک کرنٹ محسوس ہوا اور میں گھوڑے کی دم پکڑ کر پانی کے اندر چلا گیا۔ بنسی گھوڑے کی پیٹھ پر پانی اُچھالنے لگا۔

اس کے بعد بنسی، مجھے اور گھوڑے کو ندی کے باہر لے آیا اور ہم دونوں نے مل کر تانگے کو اچھی طرح سے دھویا۔ کیونکہ مجھے لمبے سفر کے لیے ایک صاف ستھری مفت کی سواری ملی ہوئی تھی اور بنسی کو مدد کرنے کے لیے ایک مفت کا آدمی ملا ہوا تھا۔ تانگے کو دھونے کے بعد اُس نے مجھے آم پاپڑ کا ایک پیکٹ دیا جو ایک میری چچی ٹافی کی طرح آم کے گودے سے بنا ہوا تھا۔ میں نے اُسے اس طرح پھاڑا جیسے کتا گوشت کو پھاڑتا ہے۔ اس کے بعد مجھے سستی محسوس ہوئی اور میں سورج کی روشنی سے چمکتی ہوئی گرگھاس

پر لیٹ گیا۔ جھینگر اور دوسرے کیڑے مکوڑے پیڑوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے اپنی آواز میں ایک دوسرے تک پہنچا رہے تھے۔ نیل کنٹھ کا ایک جوڑا سر کے اوپر بڑی چابک دستی سے چکّر لگا رہا تھا۔

بنسی کے پاس گھڑی نہیں تھی۔ اُس نے سورج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''تین بج چکے ہیں۔ تمھاری آیا، تمھارے گھر کب آئے گی؟ وہ تمھاری دادی ماں سے زیادہ خطرناک لگتی ہے!''

''وہ چار بجے آجاتی ہے۔''

''ہمیں بہت جلد واپس جانا ہوگا۔ انھیں مت بتانا کہ ہم کہاں گئے تھے۔ نہیں تو میں تمھارے گھر کبھی دوبارہ نہیں آسکوں گا تمھاری دادی ماں میری بہترین گراہک ہیں۔''

''ان کے مرنے پر تمھیں بہت افسوس ہوگا۔''

''یقیناً، میرے دوست۔''

بنسی نے تیزی کے ساتھ تانگہ کو شہر کی طرف دوڑایا۔ ان دنوں بیل گاڑی اور تانگوں وغیرہ کی تعداد موٹروں کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔

آیا کے آنے سے پانچ منٹ پہلے ہم لوگ گھر پہنچ گئے۔ بنسی نے جانے سے پہلے یہ وعدہ کیا کہ وہ اگلے ہفتہ مجھے تانگے کی سواری پھر کرائے گا۔

دہرہ دون کا گھر بک چکا تھا۔ میرے والد نے کوئی اثاثہ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ ان دنوں، ملیریا بہت تیزی سے پھیل رہا تھا۔ وہ یہ بات نہیں سمجھ سکے اور بہت جلد ان کی صحت ملیریا کے بخار کی وجہ سے گرتی گئی۔ انتقال سے پہلے بھی وہ مستقبل کے بارے میں منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اب میرے والد دنیا میں نہیں رہے۔ ہندوستان میں دادی ماں کے ٹھہرنے کے لیے کوئی ٹھکانہ بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ بینک میں بھی کوئی پیسے باقی نہیں رہ گیا تھا۔ انگلینڈ جانے کے لیے انھیں پیسوں کی سخت ضرورت تھی اور مجبوراً انھوں نے گھر بیچنے کا فیصلہ کرلیا۔ ڈاکٹر گھوش جو اُن دنوں دہرہ دون کے ایک کامیاب ڈاکٹر تھے، انہوں

نے دادی ماں کو اس مکان کے لیے معقول رقم دینے کی پیش کش کی جو انھوں نے منظور کرلی۔

حالات تیزی سے بدلتے گئے۔ دادی ماں نے گھر کا زیادہ تر سامان بیچ دیا کیونکہ ان کے لیے یہ سامان لے جانا بہت مشکل تھا۔ ایک کباڑی گھومتا ہوا آیا اور اس نے کراکری، فرنیچر، کارپیٹ اور گھنٹہ وغیرہ بہت کم قیمت میں خرید لیا، لیکن دادی ماں کا کچھ پسندیدہ سامان بھی تھا جسے وہ بیچنا نہیں چاہتی تھیں۔ مثلاً لکڑی کے فریم والا آئینہ، اخروٹ کی لکڑی سے بنی آرام کرسی اور گلاب کی لکڑی سے بنی ہوئی لکھنے پڑھنے کی میز وغیرہ۔ ان سب چیزوں کو بیل گاڑی کے بغیر ساتھ لے جانا ممکن نہیں تھا۔

آیا کو ہمارے جانے کا پہلے تو بہت افسوس ہوا لیکن بعد میں اُسے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ دادی ماں نے آسام میں چائے کے باغات رکھنے والے ایک گھرانے میں اُس کو نوکری دلا دی ہے لیکن اس شرط پر کہ دہرہ دون چھوڑنے تک وہ انھیں کے ساتھ کام کرے گی۔

ستمبر کے آخر میں ہم دہرہ دون سے روانہ ہوئے اور تب ہی آسماں میں بادل گھر آئے اور چاروں طرف پھیل گئے اور بھینی بھینی ہواؤں کے ساتھ ہمالیہ کی پہاڑیوں سے نیچے اُترنے لگے۔ میں اور میرے والد نے مل کر جہاں درختوں کے پودے لگائے تھے، انھیں دوبارہ دیکھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ سفر کی تیاری اور جلد بازی میں اتنا جذباتی ہو گیا کہ پیپل کے پیڑ کے نیچے کے گڑھے میں سے اپنا چھوٹا سا اثاثہ جس میں لٹّو، غلیل اور صلیب شامل تھی لینا بھول گیا اور وہ اُس وقت یاد آیا جب ہم بنسی کے تانگے میں بیٹھ چکے تھے اور اسٹیشن جا رہے تھے۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی واپس جانے کا مطلب تھا کہ گاڑی چھوٹ جاتی۔

''جلدی کرو!'' دادی ماں نے گھبرا کر کہا۔ ''بنسی ہمیں جلدی پہنچنا چاہیے۔'' بنسی گھوڑے کی راسیں کستے ہوئے زور سے چلایا۔

''ہے ہے۔'' اور گھوڑے کی رفتار تیز ہوگئی۔

''نو بجنے میں پانچ منٹ ہیں۔'' انھوں نے کہا۔ ''اور گاڑی نو بجے چلی جاتی ہے۔''

''فکر مت کرو میم صاحب، میں تمھیں پندرہ سال سے اسٹیشن لے جا رہا ہوں۔ کیا کبھی تمھاری گاڑی چھوٹی۔''

''نہیں۔'' دادی ماں نے جواب دیا۔ ''بنسی شاید اب کبھی دوبارہ تم مجھے اسٹیشن نہیں لے جا پاؤ گے۔''

وقت بدل رہا ہے، میم صاحب آپ کو نہیں معلوم کہ اب دہرہ دون میں تانگے کے مقابلے میں ٹیکسی اور کاریں چلنے لگی ہیں؟ آپ خوش قسمت ہیں کہ یہاں سے جا رہی ہیں۔ اگر آپ یہیں رہتیں تو مجھے بھوک سے مرتا ہوا دیکھتیں۔''

''اگر گاڑی چھوٹ گئی تو ہم سب ہی بھوک سے مر جائیں گے۔''

''فکر مت کیجیے یہ بات سب جانتے ہیں کہ گاڑی کبھی وقت پر نہیں چھوٹتی اور اگر وہ واقعی نو بجے نکل جائے تو کوئی بھی گاڑی نہیں پکڑ پائے گا۔''

بنسی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ہم لوگ نو بیچ کر پانچ منٹ پر گاڑی پکڑنے کے لیے اسٹیشن پر پہنچے لیکن گاڑی ابھی تک نہیں آئی تھی۔

اسٹیشن پر بہت بھیڑ تھی۔ کچھ لوگ گاڑی کا انتظار کر رہے تھے اور کچھ لوگ اُن سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ 'آیا' پہلے سے وہاں کھڑی ہوئی بکھرے ہوئے سامان کے ڈھیر کی حفاظت کر رہی تھی۔ ہم پلیٹ فارم پر اپنے بکسوں پر بیٹھ گئے اور ہندستانی ریلوے اسٹیشن کی زندگی کا ایک حصّہ بن گئے۔ پسینے میں شرابور قلی، ریڑھی پر میگزین بیچنے والے، مٹھائی اور لڈّو بیچنے والے، بستروں اور سامان کے بیچ اِدھر اُدھر پریشان حال گھوم رہے تھے۔ مختلف لوگ، آوارہ کتّے اور کبھی کبھار اسٹیشن ماسٹر بھی بھٹکتا ہوا دکھائی دیتا۔ پھیری والوں کی آوازیں چائے گرما گرم چائے، مٹھائی، پاپڑ، گرم سموسے، دانتوں کا منجن، کیلے، غبارے، فلمی ستاروں کی تصویریں، لکڑی کے کھلونے، چکنی مٹّی کی بنی ہوئی بھگوان کی مورتیاں اور ٹھنڈا بیچنے والوں کی آوازیں یارڈ میں جاتے ہوئے اسٹیم انجن کے شور و غل میں مل گئی تھیں اور اسٹیشن ایک بازار بن کر رہ گیا تھا۔

آیا مجھے ہر طرح سے باخبر کر رہی تھی۔

''دیکھو بابا' چلتی ہوئی گاڑی سے سر کھڑکی سے باہر مت نکالنا۔ پچھلے سال ایک امریکن لڑکے کا سر کٹ گیا تھا! یہاں سے ممبئی تک اسٹیشن پر الٹی سیدھی چیزیں مت کھانا۔ کوئی اجنبی آدمی کمپارٹمنٹ میں نہ گھسے۔ پچھلے سال مسٹر و لکنس کو لوٹ کر ان کا قتل کر دیا گیا تھا۔''

گھنٹی بجی اور دور سے چھک چھک کرتا ہوا ہرے، کالے اور سنہرے رنگ کا اسٹیم انجن آتا ہوا دکھائی دیا اور ہمیشہ کے مطابق ایک آوارہ کتا گاڑی کے سامنے سے ریلوے لائن سے کود کر جاتا ہوا دکھائی دیا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ دروازے کھلے، کھڑکیوں کے شٹر گرے اور لوگوں کے چہرے دکھائی دیے۔ گاڑی رکنے سے پہلے ہی لوگ اندر گھسنے اور باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ چند لمحوں کے لیے نظام درہم برہم ہو گیا۔ بھیڑ میں لوگ طوفان کی طرح کبھی آگے کی طرف بھاگتے اور کبھی پیچھے کی طرف۔ نہ کوئی گاڑی کے اندر گھس پا رہا تھا اور نہ ہی کوئی باہر نکل پا رہا تھا۔ سو لوگ اگر اُتر رہے تھے تو دو سو لوگ گھسنا چاہتے تھے۔ کوئی راستہ دینے کو تیار نہیں تھا۔ ایک آدمی کے گھڑکی کے راستے سے باہر آنے پر کچھ مسئلہ ہوا۔ دوسرے لوگ بھی اس کی دیکھا دیکھی کھڑکی سے باہر نکلنے لگے۔ اس طرح دروازوں پر دباؤ کچھ کم ہوا اور لوگ بھنچ کر ڈبوں میں داخل ہونے شروع ہوئے۔

بنسی اور آدھا درجن قلیوں کی مدد سے دادی ماں فرسٹ کلاس کے ڈبے میں گھس کر فوراً ہی اپنی ریزرو برتھ پر بیٹھ گئیں۔ ہم لوگ بھی جلدی سے سامان لے کر اس ڈبے میں داخل ہو گئے۔ زوردار سیٹی کی آواز سنائی دی اور گاڑی چل پڑی۔ بنسی چلتی ہوئی گاڑی سے کود گیا۔

انجن کی رفتار تیز ہوتے ہی میں 'آیا' کی ہدایت کو بھول گیا اور اپنا سر کھڑکی کے باہر نکال کر گزرتے ہوئے پلیٹ فارم کو دیکھنے لگا۔ 'آیا' اور بنسی ہاتھ ہلا رہے تھے اور میں بھی انھیں دیکھ کر اس وقت تک ہاتھ ہلاتا رہا جب تک گاڑی اندھیرے میں نہیں چلی گئی۔ دہرہ

دون کی روشنیاں مدھم ہوگئیں اور دیہاتوں کی بجھتی ہوئی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ تارے بھی صاف دکھائی دینے لگے۔ مجھے ایک تیز رفتار ٹوٹا تارا جنت سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے یاد آیا کہ 'آیا' نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ ان تاروں میں نیک لوگوں کی روحیں بسی ہوتی ہیں۔ ٹوٹے تارے میں اپنے والد کی روح کو محسوس کرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کیا ہماری روانگی کے بارے میں انھیں معلوم ہے۔ کیا وہ اس سفر میں ہمارے ساتھ ہوں گے۔ تب ہی مجھے 'آیا' کی بتائی ہوئی ایک اور بات یاد آئی۔ ٹوٹتے تارے کو دیکھ کر اگر کوئی اُسی وقت اپنی پانچوں انگلیوں کو منہ کے اندر ڈال کر کوئی دعا مانگے تو اس کی دعا ضرور قبول ہوگی!

اس حال میں دیکھ کر دادی ماں نے مجھ سے پوچھا: ''اگر تم تاروں میں کھوئے ہوئے ہو تو زمین پر کیا کر رہے ہو؟''

''دُعا مانگ رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوہ!'' دادی ماں بولیں۔

پھر وہ اپنے کام میں مصروف ہوگئیں۔ اس کے بعد نہ انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا اور نہ میں نے انھیں کچھ بتایا۔

●●●

کلپسو کرسمس

لندن میں میرا پہلا کرسمس تھا اس موقع پر میں خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔ سوئٹس کا ٹیچ کے پاس میرا چھوٹا سا کمرہ تھا جو بہت ٹھنڈا رہتا تھا۔ میری مکان مالک نے کسی طرح کے شور شرابے کی اجازت نہیں دی تھی۔ میرے پاس سنیما دیکھنے یا کسی اچھے ریسٹورنٹ جانے کے لیے پیسے بھی نہیں تھے۔ میں گیس کی انگیٹھی کے سامنے بیٹھا ٹوسٹ اور پھلیاں کھاتے ہوئے سستی سی شراب پی کر اپنا پہلا انگلش کرسمس کا دن مناتے ہوئے اپنا وقت گزار رہا تھا اور ہندستانی دوستوں کے بھیجے ہوئے کرسمس کارڈ جو انگیٹھی کے حاشیہ پر لٹکے ہوئے تھے انھیں دیکھ کر مجھے تسلّی ہو رہی تھی۔

لیکن اگلے سال میرے حالات بہتر ہوگئے۔ میں نے زیادہ پیسہ کمایا اور ایک اچھے کشادہ اور صاف ستھرے کمرے میں رہنے لگا۔ نئی مکان مالک نے میرے دوستوں اور یہاں تک کہ لڑکیوں کو بھی گھر میں آنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ میرے لیے آلو بخارے کی بنی ہوئی کھیر (پڈنگ) بھی بنا دیتی تھی جس سے میں اپنے دوستوں کی خاطر کر سکوں۔ میرے دوستوں میں ہندوستانی اور کامن ویلتھ سے آئے ہوئے طلبا بھی شامل تھے۔ انھیں کے ذریعہ میں جارج سے ملا جو نہایت ہی حساس اور انسان دوست تھا اور ترینیداد کا رہنے والا تھا۔

جارج طالب علم نہیں تھا۔ اس کی عمر تیس سال سے زیادہ تھی۔ ہزاروں دوسرے

ویسٹ انڈیز کی طرح وہ بھی انگلینڈ آیا تھا۔اس نے بتایا کہ یہاں پر نوکریوں کی کمی نہیں ہے اور سرکار کی طرف سے دوائیوں اور بیمہ وغیرہ کا مفت انتظام ہے۔ یہاں وہ ایک ہفتہ میں دس سے بارہ پونڈ تک کما سکتا ہے، جبکہ ترینیداد اور جمائیکا میں اتنا نہیں کما سکتا۔ یہ بات سچ تھی کہ انگلینڈ میں نوکریاں بہت تھیں لیکن اس سچائی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مقامی مزدور باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو نوکری دینے پر اعتراض کرتے تھے۔لیکن ان آنے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اقلیت میں تھے اور پس ماندہ تھے اور انھیں نوکری کی ضرورت تھی اور وہ اپنی محنت اور جفاکشی کے ذریعہ اپنی پہچان بنا سکتے تھے۔

بہرحال باہر سے آئے ہوئے لوگ لندن میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے تھے لیکن ویسٹ انڈیز سورج نکلتے ہی شور شرابے اور گانے بجانے کے عادی تھے جبکہ لندن میں ایسا رواج نہیں تھا۔

سردی کے موسم میں لندن کے لوگ سبز مائل اور دھندلے رنگ سے ملتے جلتے کپڑے پہنتے تھے جو دھند اور بارش کے موسم میں آرام دہ ہوتے تھے۔لندن کے لوگ گہرے رنگوں کو ظلم کی نشانی تصور کرتے تھے۔ وہ پرسکون زندگی کے عادی تھے۔انھیں کسی طرح کا شور وغل پسند نہیں تھا۔اس کے برخلاف ویسٹ انڈیز شوخ مزاج تھے اور گانے بجانے اور شور شرابے کے بہت شوقین تھے۔ اکثر اُن کے گھروں پر پارٹیوں کا اہتمام ہوتا رہتا تھا اور وہ انگلینڈ کو اپنا ہی ملک تصور کرنے لگے تھے۔ وہ بارش، دھند یا کسی بھی موسم میں اس طرح رہتے تھے جیسے وہ اپنے ملک ترینیداد میں رہا کرتے تھے۔

جارج برٹش ریلوے کے ایک زمین دوز اسٹیشن پر ٹکٹ کلکٹر تھا اور اُسے یہ کام پسند بھی تھا۔اس کام کے ایک ہفتے میں اسے تقریباً دس پونڈ مل جایا کرتے تھے۔ وہ لمبا چوڑا لحیم شحیم موٹے ہاتھ پیروں والا شریف انسان تھا جس کے جنبش کرتے ہوئے چہرے سے ہمیشہ خوش نما تاثرات نمایاں ہوتے تھے۔ دوسرے ساتھیوں کی طرح وہ بھی پیانو بجانے کا بہت شوقین تھا۔ میرے کمرے میں ایک پرانا بوسیدہ پیانو تھا۔ وہ اکثر شام کے وقت اپنی موٹی انگلیوں سے اُس کے بٹن کو دبایا کرتا تھا جس کی بے سُری آواز چاروں طرف

پھیل جاتی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک اچھا آدمی ہے۔اس کے ساتھ کرسمس منایا جاسکتا ہے۔ میں نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا: ''میری مکان مالک نے پڈنگ بنائی ہے۔ایک شراب کی بوتل بھی رکھی ہوئی ہے۔۔کیا تم اس میں شامل ہو سکتے ہو؟''

مجھے معلوم تھا کہ جارج کو مدعو کرنے کا مطلب ہے کہ اس کے دوست احباب اور رشتہ داروں کے علاوہ ترینیداد میں رہنے والا کوئی اور بھی اس کے ساتھ آسکتا ہے۔

کرسمس کے دن ٹھیک آٹھ بجے Hampstead Heath کے نیچے سے آنے والی ٹھنڈی ہوا خاموش پتوں کو ہلا رہی تھی۔ جارج کی قیادت میں ویسٹ انڈیز کی مختلف قسم کی فوج بلیا ئزا یونیو کے نیچے سے آتی ہوئی دکھائی دی۔

میں نے حیرت انگیز انداز میں اُن کے لیے دروازہ کھولا۔ جارج کے ساتھ اُس کے بھائی، بھتیجے اور دوست وغیرہ مسکراتے ہوئے اور ہاتھ ہلاتے ہوئے اور میرے کمرے کی تعریف کرتے ہوئے داخل ہوئے اور بولے: ''کیا بہترین پیانو ہے۔اس انوکھی تصویر کو دیکھو اور یہ کرسی تو ہمیں حیرت میں ڈال رہی ہے۔''

اور بلا تکلف وہ اپنے گھر کی طرح محسوس کرنے لگے۔اس تقریب کے لیے ہر ایک کچھ نہ کچھ تحفہ ساتھ لایا تھا۔ جارج کے پاس بہت سی بیئر کی بوتلیں تھیں۔ ایرک جو سانولے رنگ کا ایک نوجوان تھا بہت سی سگریٹ اور بیئر کی بوتلیں لایا تھا۔ ماریہ، جو گداز جسم والی پینتیس سالہ خاتون تھی اُس نے میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی میرے گلابی گالوں کی تعریف کی اور بوسہ دیا۔ وہ اپنے ساتھ سُور کا خشک گوشت اور انڈے لائی تھی۔اس کی سولہ سال کی بیٹی لوسی جو عنفوانِ شباب میں تھی، گراموفون لے کر آئی تھی جبکہ اس کا بھتیجا کچھ رِکارڈز لایا تھا۔ دوسرے دوست احباب بھی اپنے ساتھ بیئر لائے تھے۔ ایک من چلے دوست نے زمین قند شراب کی ایک بوتل پیش کی۔

اس کے بعد سب لوگ ایک ساتھ مل کر جشن منانے لگے۔لوسی نے گراموفون پر ''بیس اسٹریٹ بلیوز'' کا رکارڈ لگا دیا اور پورا کمرہ گانے کی آواز سے گونج اٹھا اور جارج

پیانو بجا کر گانے کا ساتھ دینے لگا۔ اس کی موٹی موٹی انگلیاں پیانو کے بٹنوں پر زور زور سے پڑ رہی تھیں۔ ماریا گیس اسٹو و جلا کر بیکون اور انڈے تلنے میں مصروف ہو گئی۔ ادھر ایرک، بیئر کی بوتل کھول رہا تھا۔ اس شور و غل کے دوران دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ دروازہ کھولنے پر وہاں مالک مکان موجود تھی۔

کمرے پر چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے اس نے کہا، ''مسٹر بونڈ! کچھ پڑوس کا بھی خیال کرو۔ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔'' آج کرسمس کے تہوار کی وجہ سے یہ سب لوگ یہاں جمع ہیں۔ لیکن ایک گھنٹہ میں واپس چلے جائیں گے۔''

وہ سر جھٹکتی بڑبڑاتی ورانڈے سے ہوتی ہوئی واپس نیچے چلی گئی اور میں نے کمرے کی کھڑکیوں کو بند کر کے اُن پر پردے ڈال دیے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ پڑوسیوں تک اس شور شرابے کی آواز نہیں جائے گی اور وہ سوچیں گے کہ شاید ہم سنیما دیکھنے چلے گئے ہیں۔ جارج نے پیانو بجانا شروع کر دیا۔ ایرک اور لوسی کمرے میں ڈانس کرنے لگے اور ان کے دونوں بھتیجے بھی اس میں شامل ہو گئے۔ تب ہی اچانک ماریہ مجھے بانہوں میں کس کر ''کلپسو میوزک'' سکھانے لگی۔ اس وقت گراموفون پر ''بنانا بوٹ سانگ'' بج رہا تھا۔

اس طرح پارٹی کو ختم ہونے میں تین گھنٹے لگ گئے، جبکہ یہ پارٹی ایک گھنٹہ میں ختم ہونی تھی۔ ہم لوگوں نے ساری شراب پی لی اور خوب انڈے کھائے۔ میں نے ماریہ، لوسی اور اُن کے دونوں بھتیجوں کے ساتھ خوب ڈانس کیا۔ ڈانس کرتے کرتے وہ لوگ اچانک جوش میں چیخ پڑتے ''فائر''؟ میں بھی ان کے ساتھ انجانے میں یہ کہہ کر چیخ پڑتا ''فائر۔'' اس لفظ میں ایک عجیب قسم کا جوش بھرا ہوا تھا۔

وہ سب بہت پیارے اور اچھے دوست تھے اور انھوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ کرسمس پارٹی میں شرکت کی اور اسے ایک یادگار کرسمس پارٹی بنا دیا۔

آہ مجھے آج بھی جارج ماریا، لوی اور ایرک کے چہرے یاد ہیں۔

آدھی رات ہو چکی تھی اور میں لوسی کے ساتھ ڈانس کر رہا تھا کہ اچانک لائٹ چلی گئی اور کمرے میں اندھیرا چھا گیا اور لوسی نے مجھے بوسہ دیا۔ اس وقت میں اپنے آپ کو خوش

قسمت محسوس کر رہا تھا۔

آدھی رات ہو چکی تھی۔ بس یا کسی دوسری سواری کا انتظام بھی نہیں تھا۔ اس لیے وہ سب لوگ ایک ساتھ گروپ کی شکل میں ہائی وے گولڈن گرین تک پیدل ہی چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد چاروں طرف سناٹا چھا گیا، صرف میری سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہوا ٹھنڈی تھی۔ اس لیے مجھے سردی کا احساس ہونے لگا۔ گلی کے دوسرے گھروں کی کھڑکیوں اور دروازوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور چاروں طرف سناٹا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے صرف ہم لوگوں نے ہی کرسمس منایا ہے۔

●●●

دہلی کا آخری سفر

میرے پاس کئی برس سے ایک نیگیٹیو پڑا ہوا تھا۔ میں نے اُس سے فوٹو بنوانے کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ دراصل یہ میری نانی کی تصویر تھی۔

مجھے اپنی نانی اچھی طرح یاد ہیں کیونکہ ان کے بیوہ ہونے کے بعد میرا زیادہ تر بچپن دہرہ دون میں انھیں کے ساتھ گزرا تھا اور سبھی لوگ بتاتے ہیں کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ وہ سخت مزاج اور تنہائی پسند تھیں اور میں اُن سے کچھ کچھ ڈرتا بھی تھا۔

خاندان کے اور لوگوں کی تصویریں میرے پاس نہیں تھیں، بس یہ ایک نیگیٹیو ہی تھا جو بہت دنوں سے پڑا ہوا تھا اور جس پر دھبّے پڑ گئے تھے۔

پچھلے ہفتہ میں اپنی ماں سے ملنے گیا تھا جو دہلی کے ایک ہسپتال میں داخل تھیں اور وہ اپنے آپریشن کا انتظار کر رہی تھیں۔ میں نے اپنی ماں سے نانی کے بارے میں بات کی اور اس نیگیٹیو کے بارے میں بتایا اور میں نے طے کیا کہ اس کا ایک فوٹو اپنی والدہ کے لیے ضرور بنواؤں گا۔

میں فوٹو میں پچیس سال بعد پہلی بار اُن کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ یہ فوٹو میری والدہ سے بہت مشابہت رکھتا تھا۔ میں بھی ان کی طرح ایک کمرے میں خوشی سے سادہ زندگی گزارتا اور وہ بھی اپنے کمرے میں رہنا پسند کرتی تھیں۔ باقی حصہ میں گھر کے دوسرے لوگ

رہتے تھے اور میں بھی اُن کی طرح اپنے کام میں مصروف رہتا تھا لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ جسمانی اعتبار سے میری ماں سے زیادہ مجھ سے مشابہت رکھتی ہیں۔ بالکل میری طرح ان کے خوبصورت بال، بھرا ہوا جسم، اونچا ماتھا تھا۔

فوٹو میں وہ برآمدے کی اونچی سیڑھی پر کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں اور میرے نانا اُن کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ ان پر آم کے درخت کا سایہ پڑ رہا تھا۔ لیکن وہ تصویر میں واضح نہیں تھا۔ اور اس کے پتوں کا سایہ دیوار پر بھی پڑ رہا تھا جس کی بناوٹ سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ آم کا درخت ہے۔

میرے نانا پتلے دبلے لیکن صاف ستھرے انسان تھے۔ ان کے چہرے پر نیچے کی طرف جھکی ہوئی مونچھیں تھیں جو بیسویں صدی میں فیشن سمجھی جاتی تھیں۔ مگر وہ تصویر میں اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ ان کا رنگ کالا تھا، کپڑے بھی اچھے نہیں پہنتے تھے۔ ان کے چلنے کا انداز سڑک پر سامان بیچنے والے کسی دکاندار کی طرح تھا۔ میری ماں نے بتایا کہ وہ ایک مرتبہ میری نانی کو بھی خراب سنتروں کی ایک ٹوکری بیچ آئے تھے۔ میری نانی میں ملکہ وکٹوریہ کی طرح شائستگی تھی اور وہ مضبوط شخصیت رکھتی تھیں لیکن میرے نانا اُن کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط تھے۔ دونوں میں اچھا تال میل تھا۔

میں یہ تصویر اپنی والدہ کو دکھانا چاہتا تھا جن کا لیڈی ہارڈنگ ہسپتال میں آپریشن ہونے والا ہے اور جو اپنے بائیں چھاتی کے کٹنے کا انتظار کر رہی تھیں۔

اگست کی ابتدا تھی۔ موسم میں بڑی خشکی اور اُمس تھا۔ رات میں کچھ بارش بھی ہوئی تھی۔ لیکن اب سورج نکل آیا تھا۔ میری شرٹ پسینے سے چپک رہی تھی۔ میں ایک چھوٹی سی ٹیکسی میں پیچھے کی طرف بیٹھ گیا جو نئی دہلی کے علاقہ کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔

سڑک کے کنارے خوشحال پنجابیوں کے گھر دکھائی دے رہے تھے جو 1947 میں ہجرت کرکے دہلی آئے تھے اور اب راجدھانی میں آدھے سے زیادہ آبادی انھیں لوگوں کی تھی۔ یہ محنتی، صحت مند اور ترقی یافتہ تھے۔ تیس سال پہلے سڑک کے دونوں جانب جہاں تک نظر جاتی تھی میدان دکھائی دیتا تھا۔ اراولی پہاڑیوں کا نچلا سپاٹ حصہ رِج

کہلاتا تھا، جہاں دور تک پھیلے ہوئے جنگل میں کالے ہرن گھومتے تھے۔ اس ویران جنگل میں فیروز شاہ کی (چودھویں صدی) شکارگاہ تھی جو آج بھی موجود ہے مگر یہ پٹرول پمپ بننے کی وجہ سے اب دکھائی نہیں دیتی اور کاروں، بسوں، ٹرکوں اور اسکوٹروں کی آوازوں میں غائب ہوگئی ہے۔ مور جنگل سے اُڑ گئے اور کالے ہرن بھی غائب ہو گئے ہیں۔ صرف گیدڑ باقی رہ گئے ہیں۔ ہماری زمین دوسرے سیاروں کے لیے تصوراتی دنیا ہے۔ آج سے ہزاروں سال بعد جب انسانی زندگی ختم ہو جائے گی تو اس کے بعد کوّے اور گیدڑ ضرور باقی رہ جائیں گے۔

ہسپتال کے اندر داخل ہونا مشکل ہو گیا تھا کیونکہ تقریباً ایک میل پہلے ہی سے پنچ کوئیاں روڈ کا فٹ پاتھ چائے والوں اور فرنیچر کی دکانوں کے سامان کے ڈھیر سے گھرا ہوا تھا۔ گیٹ کے پاس ہی ایک پانی کا نل لگا ہوا تھا جس سے گندہ پانی سڑک پر بہہ رہا تھا۔

میری ماں ایک چھوٹے سے کمرے میں تھیں جو ٹھنڈا تھا لیکن اس میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور چھت کا پنکھا گھوم رہا تھا۔ جنوبی ہند کی ایک سانولی سی نرس میری ماں کی تیمارداری کر رہی تھی۔ وہ چشم زدن میں اُٹھی اور اس نے چارٹ پر ایک نشان لگا دیا۔

میری ماں نے ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ اُن کے گال، بخار اور حرارت سے تمتما رہے تھے۔ وہ بالکل فکرمند نہیں تھیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کل کا آپریشن انھیں صرف ایک سال کی زندگی اور دے سکتا ہے۔ میں ان کے بیڈ کی پائینتی پر بیٹھ گیا۔ جرمنی سے واپس آنے کے بعد میں ان سے تیسری بار مل رہا تھا۔ میری تمام جمع جوڑ ختم ہو چکی تھی اور میں آپریشن کے بعد ہمیشہ کے لیے واپس چلا جانا چاہتا تھا مگر یہ پہاڑ مجھے ہمیشہ بلاتے رہیں گے۔

میں نے پوچھا، ''آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہوں۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ وہ کل میرا آپریشن کریں گے اور انھوں نے سگریٹ پینے کے لیے منع کیا ہے۔''

''کیا آپ رَم پی سکتی ہیں؟''

''نہیں! آپریشن کے کچھ دن بعد تک بھی نہیں!''

چوّن سال کی عمر میں ان کے بال کافی حد تک سفید ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے چہرے پر کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہی چھوٹا سا منہ اور تھوڑی اور چمکیلی آنکھیں۔ ان کے چہرے میں اپنی والدہ سے زیادہ اپنے والد سے مشابہت تھی۔ نرس کے جانے کے بعد میں نے وہ فوٹو ماں کے ہاتھ میں دے دیا۔

''اتنے برسوں سے یہ نیگیٹیو میرے پاس تھا مگر میں نے یہ فوٹو کل ہی بنوایا ہے۔''

''میں چشمہ کے بغیر نہیں دیکھ سکتی۔''

چشمہ اُن کے بیڈ کے پاس لاکر پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے چشمہ اُٹھا کر ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ انھوں نے چشمہ آنکھوں پر لگایا اور فوٹو کو غور سے دیکھنے لگیں۔

''تمھاری نانی تم سے بہت محبت کرتی تھیں۔''

''واقعتاً وہ ایک شائستہ خاتون تھیں۔''

''جب تم نے تعلیم مکمل کی تھی تو انھوں نے جرمنی جانے کے لیے تمھارے لیے کچھ رقم دی تھی۔ وہ بہت زیادہ تو نہیں تھی لیکن ٹکٹ کے لیے کافی تھی۔ انھوں نے کچھ تو تمھارے لیے چھوڑا تھا لیکن میں نے تمھارے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔''

''تم جانتی ہو کہ میں نے پیسے کی بھی پروا نہیں کی میرے والد نے مجھے لکھنا پڑھنا سکھایا اور یہی میرا ورثہ ہے۔''

''میں نے تمھیں کچھ بھی نہیں سکھایا۔''

''شاید تمھیں نے مجھے زندگی میں خوش رہنا سکھایا۔''

''میں نے پریشانیوں میں بھی اپنے آپ کو خوش رکھا لیکن تمھارے باپ کبھی بھی خوش نہیں رہے۔ اس لیے ہم دونوں میں خوب جھگڑا ہوتا تھا اور آخر کار ہم علیحدہ ہو گئے۔''

''وہ آپ سے عمر میں بڑے تھے۔''

''تم نے ہمیشہ مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے تمھارے والد کو چھوڑا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے۔''

''میں اُس وقت بہت چھوٹا تھا اور تم اچانک مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ میرے والد نے میری نگہداشت کی جو اُن کے لیے مشکل کام تھا۔ وہ بیمار بھی رہتے تھے۔ ان حالات میں، میں آپ کو ہی برا کہتا تھا۔''

''تمھارا باپ مجھے تم سے ملنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔''

''کیونکہ تم کسی دوسرے شخص سے شادی کرنے جا رہی تھیں۔''

''میں نے گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا: ہم اس سلسلے میں پہلے بھی بات کر چکے ہیں۔ میں اپنے والد کی طرف سے وکالت نہیں کر رہا ہوں۔ الزام تراشی کا وقت گزر چکا ہے۔''

باہر بارش شروع ہوگئی۔ کھلے ہوئے دروازے سے گیلی مٹی کی خوشبو اندر آئی جس میں دوائیوں اور جراثیم وغیرہ کی بُو بھی شامل تھی۔ کالی آنکھوں والی نرس دوبارہ آئی اور اُس نے بتایا کہ ڈاکٹر جلد ہی راؤنڈ پر آنے والے ہیں۔ میں نے اپنی ماں سے کہا کہ میں شام کو دوبارہ آؤں گا یا پھر صبح آپریشن سے پہلے آجاؤں گا۔

میری ماں نے کہا کہ شام ہی کو آجانا کیونکہ اس وقت دوسرے لوگ بھی موجود ہوں گے۔

''میں دوسروں سے ملنے نہیں آیا ہوں۔''

''وہ تم سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔''

وہ میرے سوتیلے باپ اور سوتیلے بھائی تھے۔

''میں اُن سے صبح میں ملاقات کرلوں گا۔''

''جیسے تمھاری مرضی۔۔۔''

اور اب میں دوبارہ واپس آکر سڑک کے پاس فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا تھا۔ گاڑیوں کی بھیڑ بھاڑ میں ایسا لگ رہا تھا کہ ہر گاڑی والا اپنے پاس والی گاڑی سے آگے نکل جانے کی کوشش میں ہے۔ ہارن کی آوازیں ہسپتال کے کوری ڈور کے اندر ہی سے سنائی دینا شروع ہوگئی تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہر آدمی کو شور وغل کی عادت ہوگئی ہے اور کوئی بھی اس کی پروا نہیں کر رہا تھا۔ بیمار اور غیر صحت مند لوگوں کو یہ سوچ کر تسلّی ہوتی ہے کہ ایسے

لوگ بھی ہیں جو دوسروں کی تکلیف کی پروا نہیں کرتے۔ دہلی میں ہر آدمی کو لمبی قطاروں میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی خواہش رہتی ہے اور وہ کسی بھی چیز کو سب سے پہلے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ شاید اس لیے کہ کوئی بھی ایک دوسرے سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا۔

میں نے ہاتھ ہلا کر ایک اسکوٹر رکشا کو روکا جو کچھ فاصلے پر آکر رُکا۔ کسی نے مجھے ہاتھ سے پیچھے کیا اور خود اسکوٹر رکشا میں بیٹھ گیا۔ اس طرح کے طور طریقے تو کسی ''دہلی والے'' کے ہی ہو سکتے ہیں۔

میں پھر فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر کسی دوسرے اسکوٹر کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر ہوگئی مگر کوئی اسکوٹر وہاں سے نہیں گزرا۔

دہلی میں جو دوسرے نمبر پر آجاتا ہے وہ آخر نمبر پر پہنچ جاتا ہے۔

میں اپنے چھوٹے سے ہوٹل کی طرف پیدل ہی واپس چل پڑا اور راستے ہی میں یہ سوچتا ہوا چل رہا تھا کہ کہیں میں نے اپنی ماں کے آخری دیدار تو نہیں کیے۔

●●●

وہ بھی کیا دن تھے

مس میکینزی کو میں نے مالا بار کی سارڈین کا ایک ڈبہ تحفہ میں پیش کیا جس سے ان کے غصّہ کی ترشی میں کمی واقع ہوگئی۔

ایک اور ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔ اس نے چشمے کی آڑ سے میری طرف حقارت آمیز نظروں سے دیکھا اور میں اس وقت ادھ مرا سا ہوگیا۔۔۔

مس میکینزی کی عمر پچاس سال تھی لیکن اُسے دیکھ کر ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ مر جائے گی۔ وہ اس پہاڑی علاقے کی سب سے پرانی رہنے والی تھی۔ اُس کا ایک چھوٹا سا گھر پہاڑی کے راستہ میں تھا۔ اس کا گھر اُتری گاؤں میں بنے ہوئے لانگ فیلو کے گھر کی طرح تھا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ پہاڑی کی چوٹی پر بنا ہوا ہے۔ لیکن وہ پہاڑی کے آدھے راستہ پر ہی ختم ہو جاتا تھا اور وہ راستہ کے کنارے پر لگے ہوئے میپل اور اوک کے پیڑوں سے چھپا ہوا تھا۔

میں نے مس میکینزی سے کہا: ''میں پندرہ دن کے لیے دہلی جا رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم اس دوران ٹھیک ہی رہو گی۔''

مس میکینزی سے میری نہ تو کوئی رشتہ داری تھی اور نہ کوئی پرانی دوستی لیکن مس میکینزی میں ایک خوبی یہ تھی کہ وہ دوسروں کو اپنا بنا کر ان میں اپنے تئیں ذمہ داری کا احساس پیدا کر دیتی تھی۔

''مجھے گلہ نہیں ہے۔ اور ہاں، پادری نے مجھے کچھ انڈے بھجوائے ہیں۔''

کھانے پینے کی چیزیں جو اُسے ملتی تھیں وہ اسے اپنے بڑے اسٹور میں رکھ لیتی تھی۔ اس کی پنشن صرف چالیس روپے ماہانہ تھی، جس سے اُس کی دال روٹی ہی چل سکتی تھی۔ جو لوگ اسے جانتے تھے وقتاً فوقتاً انگلینڈ سے کھانے کی مختلف چیزیں پارسل کی شکل میں تحفے کے طور پر بھیجتے تھے، جس سے اُسے باتیں کرنے کا بھی ایک موضوع مل جاتا تھا۔

میں نے کہا: ''مجھے خوشی ہے کہ تمھارے پاس انڈے ہیں۔''

''یہ اب چار روپے درجن ہیں۔''

''ہاں میں جانتا ہوں۔ ایک وقت تھا کہ جب چھ آنے میں ایک درجن انڈے ملتے تھے۔''

''غالباً تمہیں سال پہلے کی بات ہے۔''

''نہیں پچیس سال پہلے کی بات ہے۔ مجھے یاد ہے کہ تب سے ٹیلر کے انڈوں کو بہت اچھا سمجھا جاتا تھا۔ راجا کے محل کے پاس فیئر نامی ایک پرانا مکان تھا وہ اسی میں رہتی تھیں۔''

''کیا اُن کا پولٹری فارم بھی تھا؟''

''ارے نہیں ان کی اپنی پالتو مرغیاں تھیں، وہ بھی معمولی نسل کی۔ وہ مرغیاں سفید یا Rhode Island Red تھیں مگر انڈے خوب دیتی تھیں۔ اُسے معلوم تھا کہ مرغیوں کو صحت مند کس طرح رکھا جا سکتا ہے۔۔۔ مے ٹیلر میری ایک اچھی دوست تھی۔ تم جانتے ہو کہ وہ سب کو انڈے نہیں بیچتی تھی۔''

''نہیں نہیں۔ ظاہر ہے۔ شاید مس ٹیلر کا انتقال ہوگیا ہے۔''

''جی ہاں، مر گئی ہیں۔''

''اوہ! مجھے اُن کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کیسے ہوا؟''

''یہ بھی ایک راز کی بات ہے۔ دراصل 'مے' اور شارلٹ ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن حیرت ہے کہ وہ ایک ساتھ رہنے پر کیسے راضی ہوگئیں۔ وہ بچپن میں

لڑا کرتی تھیں۔شارلٹ تو پہلے ہی سے بگڑی ہوئی تھی لیکن خوبصورت تھی۔ مے کو میں اُس وقت سے جانتا ہوں جب اس کی عمر پینتیس سال تھی۔ وہ ایک اچھی عورت تھی، میرا مطلب ہے کہ وہ گھر میں رہتی تھی، کھانا بناتی اور باعزت لوگوں کی طرح چرچ جایا کرتی تھی۔ اُسے سب ہی لوگ پسند کرتے تھے۔لیکن شارلٹ کا برتاؤ اچھا نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ میں کھوئی ہوئی رہتی تھی۔ والدین کی موت کے بعد تو وہ تھوڑی شراب بھی پینے لگی تھی۔''

''ان دونوں میں سے کسی کی بھی شادی نہیں ہوئی تھی؟''

''نہیں — میں سمجھتا ہوں کہ شاید وہ اس وجہ سے ساتھ رہتی تھیں۔''

''حالانکہ میں بھی اکیلی تھی۔لیکن مجھے کسی کے ساتھ رہنا پسند نہیں تھا۔''

''وہ دونوں بہنیں تھیں۔لیکن دونوں کے مزاج میں بہت فرق تھا۔شارلٹ اپنی جوانی میں بڑی خوبصورت اور منچلی ہوا کرتی تھی۔فوجیوں میں اُس کے بہت چرچے تھے۔اس زمانے میں شادی کے لیے اس کے بہت سے رشتے آئے۔لیکن وہ تیار نہیں تھی۔اور جب اُس نے شادی کرنے کا ارادہ کیا تو زیادہ رشتے نہیں تھے۔تب اس کی عمر پینتیس سال ہو چکی تھی۔اس نے بہت زیادہ شراب پینا شروع کر دی تھی۔جس میں برانڈی اور جن وغیرہ شامل تھی جوان دنوں سستی تھی اور شاید دو روپے کی بوتل تھی۔''

''عجیب مذاق ہے کہ میں ایک نسل کے بعد پیدا ہوا۔''

''یہ ایک اچھی بات بھی ہے ورنہ شاید تمھارا خاتمہ بھی چارلوٹے کی طرح ہوتا۔''

''کیا وہ بھی کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہوئی تھی؟''

''نہیں! اُس کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا لیکن شارلٹ کے ایسے ہی سخت اصول تھے جیسے آپ کے۔اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں کچھ شراب لے سکتا ہوں؟'' اُس نے مجھے ایک پرمعنی نگاہوں سے دیکھا اور شراب پیش کی۔

''کیا تم نے کبھی مے ٹیلر کے ساتھ شراب پی؟''

''کبھی نہیں! میں اس کے ساتھ کسی محفل میں نہیں رہا۔ جب وہ شراب پی لیتی تھی تو اُسے اچھے برے کی پہچان ختم ہو جاتی تھی۔وہ ایک نائی کے ساتھ بھی چلی جاتی تھی۔ایک

مرتبہ تو شام کو کھڈ میں گر گئی جس سے اس کا ٹخنہ ٹوٹ گیا۔''

''وہ خوش قسمت ہے کہ اس کا سر نہیں ٹوٹا۔''

''اس کا اپنا سر نہیں ٹوٹا مگر۔اس نے بیچاری اپنی بہن کا سر ضرور چھوڑ دیا۔''

''اس نے اپنی بہن کا سر پھوڑ دیا! نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتی۔'' مجھے اس بات پر کچھ شک ہوا۔

''کسی کو نہیں معلوم کہ کیا بات تھی۔لیکن کچھ ایسی ویسی ہی بات ہو گی۔ بہرحال ایک دن اُن دونوں میں بہت جھگڑا ہوا۔شارلٹ شراب میں دھت تھی اور مے ہمیشہ کی طرح اُسے نصیحت کر رہی تھی۔''

''شرابی کو کبھی نصیحت نہیں کرنی چاہیے۔''

مس میکینزی نے مجھے نظرانداز کرتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا۔اس نے کہا کہ شارلٹ کے سر پر جو چوٹ لگی، وہ خدا کی طرف سے بھی ایک پریشانی ہو سکتی ہے۔مگر کیا مے کا سر ہی چوٹ لگنے کے لیے رہ گیا تھا۔شارلٹ طیش میں آ گئی اور چیخ پڑی اور اُس نے مے کے سر پر کوئی بھاری چیز مار دی۔ یہ کیا چیز تھی شارلٹ نے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں نے زمین پر پڑے ہوئے ٹکڑوں کو صاف کر دیا۔شاید یہ وہی بھاری چیز تھی جس کو ادیبوں نے کٹھلا ہتھیار کا نام دیا ہے۔

دو دِن کے بعد جب چارلوٹے کو ہوش آیا تو اُس نے سوچا کہ میں نے یہ سب کچھ کیا کر دیا۔اس کے چاروں طرف چیزیں بکھری پڑی تھیں اور دیوانگی کی کیفیت میں بڑبڑا رہی تھی کہ اگر مے میرے ساتھ چپکی ہوئی نہ رہتی تو بہت پہلے ہی میری شادی ہو چکی ہوتی۔

''کیا اُس پر قتل کا الزام لگایا گیا؟''

''نہیں! کیس دبا دیا گیا اور شارلٹ کو رانچی کے پاگل خانے میں بھیج دیا گیا۔اس کے بعد ہم نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ مے کو یہیں پر دفن کر دیا گیا۔اگر تمھارا کبھی قبرستان جانا ہو تو دیکھنا کہ دوسری قطار میں بائیں طرف سے اس کی تیسری قبر ہے۔ میں کبھی کبھی

وہاں جاتی ہوں۔ جو بھی ان دونوں بہنوں کے بارے میں جانتا ہے، اُسے شدید صدمہ پہنچتا ہے۔

''میں بہت مایوس رہتی ہوں کیونکہ مے سے مجھے بہت لگاؤ تھا۔ اس کی مرغیاں تو بیچ دی گئیں اور اب مجھے انڈے دوسری جگہ سے خریدنا پڑتے ہیں۔ لیکن وہ اتنے اچھے نہیں ہوتے۔ بہرحال وہ دن بہت اچھے دن تھے جب انڈے کچھ آنے درجن اور جن کی بوتل صرف ایک روپے میں مل جاتی تھی۔''

•••

اور بینا چلی گئی

ایک دن کا ذکر ہے میں سڑک کے کنارے لگے ہوئے درختوں سے ہو کر گزر رہا تھا کہ اچانک مجھے ایک لڑکی کے گانے کی آواز سنائی دی۔

پہاڑوں پر گرمی کا موسم تھا۔ درختوں پر نئی پتیاں نکل آئی تھیں۔ ان پتّوں میں اخروٹ اور چیری کے پھل پکے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

ہوا بالکل بند تھی اور پیڑ اپنی جگہ جامد و ساکت کھڑے ہوئے تھے۔ لفظ تو سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن گانے کی آواز واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ اس سریلے نغمے کے اُتار چڑھاؤ نے مجھے اس آواز کا گرویدہ بنا دیا۔ آواز یقیناً کسی معصوم نوجوان کی تھی۔

میں نے اپنا راستہ چھوڑ دیا اور گھٹنوں کے بل ڈھلان کی طرف چیڑ کے تنوں پر چلتا ہوا بالکل نیچے جا پہنچا۔ لیکن وہاں تو نہ گانے کی آواز سنائی دی اور نہ وہاں پر کوئی دکھائی دیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا، شاید مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ پہاڑوں پر عموماً اس طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔

میں اپنے گھر کی طرف واپس چل پڑا مگر تب ہی مجھے گانے کی ایک اور آواز سنائی دی۔ یہ میٹھی اور سریلی آواز پیڑوں کے گہرے اندھیرے میں سے آ رہی تھی۔

میں اپنے بارے میں سوچنے لگا کہ ابھی تک بجلی کا بل جمع نہیں ہوا اور بینک میں کچھ بھی نہیں ہے اور میرا دوسرا ناول کسی اور ناشر کے پاس جانے کے لیے تیار ہے۔ لیکن ابھی

گرمی بہت تھی۔ انسان اور جانور سب گرمی سے اونگھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ مجھ سے قرض لینے والے لوگ بھی سست پڑ گئے تھے۔ دور دراز کے پہاڑ بے رنگ اور گرد و غبار کی وجہ سے دھندلے نظر آ رہے تھے۔

میں چیڑ کے درختوں میں ایک بار پھر داخل ہوا لیکن اس بار بھی مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ اس کے بعد ایک ہفتہ تک میں اپنے کاٹیج ہی میں رہا۔ میں نے ناول کو دوبارہ لکھا تھا اور اس پر بہت سخت محنت کی تھی۔ صرف کھانا کھانے اور سونے کے لیے ہی اُٹھتا اور ان پتّوں سے نوٹ لیتا جو گہرے ہرے ہوتے جا رہے تھے۔

کھڑکی جنگل کی طرف کھلی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے پاس شاہ بلوط، اوک، میپل، اخروٹ کے درخت لگے ہوئے تھے۔ پہاڑ کی اونچائی سے چیڑ کے پیڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ اس سے آگے پہاڑی پر دیودار کے درختوں کی فوج مارچ کرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ پیڑوں کی قطاریں دور تک چھوٹی چھوٹی دکھائی دیتی رہیں اور آخر میں دکھائی دینا بند ہو گئیں۔ اس کے بعد اُبھرتی ہوئی کالی چٹانیں دکھائی دیں جو برف سے جا ملتی تھیں۔ ان اونچائیوں کو آسمان کا پالنا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ منظر کھڑکی سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ صبح کے صاف ستھرے ماحول میں شہر کی روڈ سے اس منظر کو دیکھا جا سکتا تھا۔

پہاڑی کی تہہ میں ایک جھرنا تھا۔ ایک دن صبح سویرے گھسے ہوئے گول پتھروں پر قدم رکھتا ہوا تقریباً آدھا کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے نیچے جھرنے پر پہنچا اور چیری کے درخت کے سائے میں ایک سیدھی چٹان پر لیٹ کر پیڑ کی شاخوں سے چھنتی ہوئی سورج کی روشنی کو دیکھنے لگا جو ایک اونچی پہاڑی (پری ٹبّا) سے ہوتی ہوئی وادی میں آ رہی تھی۔

ہوا رُکی ہوئی تھی اور چڑیاں پہلے سے خاموش تھیں۔ جھرنے کے پتھریلے بستر پر پانی کے بہنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں وہاں پر دس یا شاید پندرہ منٹ تک لیٹا رہا۔ لیکن مجھے محسوس ہوا کہ کوئی مجھ کو دیکھ رہا ہے۔ کوئی مجھے پیڑوں کے سائے سے تھما ہوا، رُکا ہوا دیکھ رہا ہے۔ سب کچھ بے حس و حرکت تھا۔ ایک پتھر بھی نہیں ہلا، پیر کی شاخ بھی نہیں ٹوٹی۔ میں ڈرا تو نہیں لیکن محسوس کیا کہ کوئی اجنبی آنکھیں مجھے چھپ کر ضرور دیکھ رہی

ہیں۔ بہر حال اس چٹان سے ہٹ کر میں نے ایک الگ راستہ تلاش کیا اور پیڑوں سے ہوتا ہوا اس پہاڑی پر واپس آ گیا جہاں سے چلا تھا۔

سورج پورے عروج پر تھا۔ سخت گرمی تھی اور ہوا بھی بند تھی۔ پہاڑی پر پہنچنے تک میں پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ مگر مجھے دیکھنے والے کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ دو مریل سی گائیں گھاس چر رہی تھیں۔ اس گرم موسم میں صرف گائے کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنی کھڑکی سے ایک بار پھر وہی آواز سنی بالکل وہی آواز اور گانے والی بھی ضرور وہی تھی۔ میں جو کتاب پڑھ رہا تھا اُسے ایک طرف رکھا اور کھڑکی سے جھک کر نیچے پیڑوں کی طرف دیکھا لیکن گھنے پتوں میں کچھ دِکھائی نہیں دیا اور گانے والی بھی اتنی دور تھی کہ وہاں تک پہنچنا بہت مشکل تھا۔ میں نے سوچا کہ کیا مجھے اُس سے ملنے جانا چاہیے؟ اس کو دیکھنے سے بہتر ہے کہ اس کی آواز سنی جائے کیونکہ میں نے آواز سے محبت کی ہے گانے والی سے نہیں۔ یقیناً مجھے گانے نے نہیں آواز ہی نے اپیل کی ہے۔۔۔ آخر کار آواز آنا بند ہو گئی اور میں کھڑکی سے واپس چلا آیا۔

ایک لڑکی پہاڑی کے پاس رس بھری جمع کر رہی تھی۔ خوبصورت رنگ، تازہ چہرہ، اُس کے شیشے کی طرح چمکتے ہوئے ہونٹوں میں ارغوانی رنگ جھلک رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ ''کیا یہ پھل کھانے میں اچھے ہوتے ہیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

اُس نے اپنی مٹھی کھولی اور ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ اُس کی مٹھی میں بہت سی مسلی ہوئی رس بھریاں تھیں۔ میں نے اُن میں سے ایک اٹھائی اور منہ میں ڈال لی۔ اس کا مزا بہت تیکھا اور کھٹا تھا۔ ''اس کا مزا اچھا ہے۔'' میں نے کہا۔ میں اس کی زبان بہت مشکل سے اور رک کر بول رہا تھا۔ اس نے میرے قریب آ کر کہا کہ اور لے لو اور میرے ہاتھ میں بہت سی رس بھریاں بھر دیں۔ اس کی انگلیوں نے مجھے چھو لیا۔ یہ عجیب قسم کا احساس تھا۔ غالباً ایسا نویں یا دسویں بار ہوا تھا کہ میرا ہاتھ کسی لڑکی نے چھوا ہو۔

''تم کہاں رہتی ہو؟'' میں نے اُس سے پوچھا۔

اُس نے وادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا: ''پہاڑ کی ڈھلان پر وہ کھڑا ہوا ایک گاؤں ہے۔ وہیں میں رہتی ہوں۔''

''وہ تو بہت دور ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم ہمیشہ اتنی دور سے آتی ہو؟''

''میں واپس بھی اتنی ہی دور جاتی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''گائے کو تازہ گھاس چاہیے۔ کچھ لکڑیاں جمع کرنی ہوتی ہیں اور گھاس وغیرہ کاٹنی ہوتی ہے۔'' اور اُس نے اپنے کمر میں کپڑے سے بندھی ہوئی درانتی دکھائی۔ ''کبھی میں پری ٹبّا جاتی ہوں اور کبھی کبھار اُس وادی کے پیچھے۔ آپ کبھی اُدھر گئے ہیں؟''

''نہیں میں وہاں نہیں گیا لیکن کسی دن جاؤں گا۔''

''پری ٹبّا پر ہمیشہ ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔''

''کیا یہ سچ ہے کہ وہاں پر پریاں رہتی ہیں؟''

اُس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: ''یہ تو لوگ کہتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو کبھی وہاں پر نہیں گئے۔''

''یہ کہا جاتا ہے کہ پہاڑوں کے غاروں میں بھوت پریت رہتے ہیں۔ لیکن میں نے تو آج تک کچھ نہیں دیکھا۔''

''بھوتوں کے بارے میں سنا تو ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا یہ سچی کہانی ہے کہ دو پریمیوں نے بھاگ کر اُس پہاڑی کی گپھاؤ میں پناہ لی تھی۔ بجلی اور طوفان میں اُن کی موت ہوگئی تھی۔''

''میں نے یہ کہانی سنی ہے لیکن یہ میرے، پیدا ہونے سے پہلے کی بات ہے۔ اب پری ٹبّا پر بھوت پریت نہیں رہتے۔''

''تمھاری عمر کتنی ہے؟'' میں نے اُس سے پوچھا۔

''مجھے یاد تو نہیں ہے لیکن یہی پندرہ سولہ سال ہوگی۔''

''کیا تمھاری ماں کو بھی نہیں معلوم؟''

''اُن کا انتقال ہو چکا ہے اور میری دادی کو کچھ یاد نہیں ہے۔ میرا بھائی مجھ سے بہت

چھوٹا ہے۔ اس کو بھی اپنی عمر یاد نہیں۔ کیا عمر یاد رکھنا ضروری ہے؟''

''نہیں، ضروری نہیں ہے اور یہاں پر، بہرحال پہاڑوں اور چٹانوں پر سو سال بھی ایک دن کی طرح لگتے ہیں۔''

''تم تو بوڑھے ہو۔'' اُس نے کہا۔

''میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔ کیا میں تمھیں بوڑھا لگتا ہوں؟ کیا ہوگی میری عمر؟''

اُس نے کہا ''سو سال'' اور پھر قہقہہ لگاتے ہوئے اپنے ہاتھ کو منہ پر رکھ لیا۔ اُس کی کلائی میں چاندی کی چوڑیاں چمک رہی تھیں۔

''تم کیوں ہنس رہی ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''کیونکہ تمھیں دیکھنے سے ایسا لگ رہا ہے کہ تم میری بات پر یقین کر رہے ہو۔ تمھاری عمر کیا ہے؟''

"مجھے یاد نہیں، پینتیس یا چھتیس سال ہوگی۔''

''بھول جانا ہی اچھا ہے!''

''ہاں یہ سچ ہے۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''لیکن فارم بھرتے وقت ایسی چیزیں مثلاً عمر وغیرہ صحیح لکھنا پڑتی ہیں۔''

''میں نے کبھی فارم نہیں بھرا اور فارم صرف کاغذ کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے جس میں بیکار کی باتیں لکھی ہوتی ہیں۔ یہ صرف انسانی ترقی کا ایک حصہ ہے۔''

''ترقی؟''

''ہاں، کیا تم خوش نہیں ہوئیں؟''

''نہیں۔''

''تمھیں غصہ آیا؟''

''نہیں۔''

''کیا تمھیں ترقی کرنا اچھا نہیں لگتا؟ جنگلی رسی بھری ہی اچھی ہے۔''

''اور وہ بغیر سلام کیے ہوئے چلی گئی۔ گائیں اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں اور وہ انھیں

نیلو، بھوری کہتی ہوئی ننگے نازک پیروں سے چٹان اور گھاس پر دوڑ رہی تھی۔

مئی کی ابتدا تھی۔ جھینگر جنگل میں گا رہے تھے۔ وہ اپنی ٹانگوں کے ذریعہ ناچ کر آواز بھی نکال رہے تھے بلکہ وہ پیڑوں کی اونچائیوں پر ایک دوسرے کی آوازوں کا جواب دیتے ہوئے بازی گرانہ انداز میں اُڑان بھی بھر رہے تھے۔ کبھی کبھی لنگور بھی اوک کے پیڑ پر پتیاں کھانے آ جاتے۔ جیسے ہی میں جھرنے کی طرف بڑھا۔ میں نے بالکل وہی آواز سنی جو آج مجھے پانی کے کنارے واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اس لڑکی کو چٹان پر بیٹھے ہوئے دیکھا جو چلتے ہوئے تیز پانی میں اپنے پیر ڈالے ہوئے بیٹھی تھی۔ وہ لڑکی جس نے مجھے بہت سارے رس بھری کے پھل دیے تھے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ گلوکارہ ہے۔ اجنبی آواز سن کر میرے ذہن میں تخیلاتی شکلیں مثلاً لڑکی ایک پری، نرم و نازک خوبصورت دیوی کی طرح کی معصوم آنکھیں، گول دودھیا چہرہ، پتلی دُبلی، اُس کی دھوتی کھردری سی، گھریلو ساڑی پھٹی ہوئی۔ وہ بے کار سے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ پہاڑوں پر چلنے کی وجہ سے گاؤں کے لوگ اپنی لڑکیوں کو بارہ سال کی عمر تک دھوتی پہناتے ہیں۔ لڑکی نے لٹکے ہوئے کپڑے کو مضبوطی کے ساتھ کس کر کمر سے باندھا اور جھالردار اسکرٹ پہن لیا تاکہ پہاڑیوں پر دور تک جانے میں آسانی ہو جائے۔

لیکن میرے ذہن سے اس کے نقش ہٹے نہیں تھے اور میرے تخیل میں اس کا معصوم اور کھلکھلاتا ہوا چہرہ موجود تھا۔ اس کی سریلی آواز سے اور بھی دلکشی پیدا ہو گئی تھی۔

میں نے اُسے جھرنے کے کنارے سے دیکھا۔ اس وقت وہ اوپر یعنی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کھسیا گئی اور اُس نے اپنی سیاہ جیبھ نکال کر مجھے چڑایا۔ یہ بہترین طریقہ تھا مجھے مبارکباد دینے کا۔ میں نے سوچا۔ کیا میں نے اُس کے دل کو کوئی ٹھیس پہنچائی ہے؟

''تم نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ بلایا کیوں نہیں؟'' اس نے میرے قریب آ کر کہا۔

''کیونکہ میں تمھارا گانا سن رہا تھا اور گانا ختم ہونے تک تم سے بات نہیں کر سکتا تھا۔''

''وہ تو صرف ایک گیت تھا۔''

''لیکن وہ تم نے بہت سریلی آواز میں گایا تھا۔''

اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم کچھ کھانے کے لیے لائے ہو؟''

''نہیں تو۔ کیا تمھیں بھوک لگ رہی ہے؟''

''ہاں، مجھے بھوک تو لگ رہی ہے۔'' اُس نے مزید کہا۔

''جب بھی تم مجھ سے ملنے آؤ کچھ نہ کچھ ہمیشہ میرے لیے کھانے کو ضرور لایا کرنا۔''

''لیکن میں تم سے ملنے نہیں آؤں گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم یہاں پر ملوگی بھی یا نہیں۔''

''تم مجھ سے ملنا نہیں چاہو گے؟''

''میں نہیں بتا سکتا۔ لیکن تم سے ملنا اچھا لگتا ہے۔''

''میں تمھیں ہمیشہ جنگل ہی میں ملوں گی لیکن میرے کھانے کے لیے ہمیشہ ضرور لایا کرنا۔''

''آئندہ ایسا ہی کروں گا۔ کیا میں تمھارے لیے رس بھری کے پھل لا سکتا ہوں؟''

''آئندہ جب آپ دوبارہ پہاڑ کی چوٹی پر جائیں گے تو وہاں تمھیں انگور کی جھاڑیاں ملیں گی۔''

''یہ سب کچھ میں نہیں جانتا اگر بھوک لگی ہے تو میں کچھ تمھارے لیے کھانے کو لاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اُس نے جواب دیا۔ لیکن جب میری نگاہ اس کے پیروں کی طرف گئی تو وہ اُس وقت بھی پانی میں پڑے ہوئے تھے۔ ایک بار پھر 'نائٹ ایرنٹ' کی طرح میں دوبارہ بڑی مشقت اور جانفشانی کے ساتھ اس وقت تک پہاڑی پر پڑھتا رہا جب تک میں رس بھری کی جھاڑیوں تک نہیں پہنچ گیا اور رس بھری کے پھلوں کو اپنی جیب میں نہیں ٹھونس لیا۔ لیکن جب جھرنے کی طرف واپس آیا تو وہ وہاں سے جا چکی تھی اور دور پہاڑی پر بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اندھیری رات کے سناٹے میں جگنو چمک رہے تھے۔ جھینگر، ہرن، کانٹے دار چوہے اور پتنگوں کی آوازیں کھڑکی کے دروازوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وادی کے اُس پار پہاڑی پر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں جھلملاتی ہوئی روشنی اور مٹی کے تیل کے ٹمٹماتے ہوئے دیے دکھائی دے رہے تھے۔

''تمھارا نام کیا ہے؟'' میں نے اُس سے پوچھا جب ہم چیڑ کے جنگل میں راستہ پر ملے۔

''بینا۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''اور تمھارا کیا نام ہے؟''

''میرا کوئی نام نہیں ہے۔''

ٹھیک ہے مسٹر نونیم۔''

''میرا مطلب ہے کہ میں نے اپنا نام خود نہیں رکھا ہے۔ ہمیں اپنے نام خود رکھنے چاہئیں۔ کیا یہ ٹھیک نہیں ہے؟''

''بینا میرا نام ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی اور نام اچھا نہیں لگتا۔''

''اچھا!''

''تم کہاں جا رہے ہو؟''

''کہیں نہیں۔''

''نونیم کہیں نہیں جاتا تم میرے ساتھ نہیں آ سکتے۔ کیونکہ میں گھر جا رہی ہوں۔ میری دادی نے گاؤں میں کتّے پالے ہوئے ہیں۔ اگر تم میرے پیچھے آئے تو۔'' اور وہ ہنستی ہوئی جھرنے کی طرف نیچے چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ میں اسے نہیں پکڑ پاؤں گا۔

اونچی پہاڑی پر چلتے وقت اُس کا چہرہ پسینہ سے شرابور تھا۔ وہ سفید گائے کو گھر کی طرف بلا رہی تھی۔ تیز ہوا میں پہاڑی کی ایک طرف وہ چھوٹی سی لگ رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر بالوں کی لٹیں آئی ہوئی تھیں اور ان پر پھٹی ہوئی نیلی دھوتی لپٹی ہوئی تھی۔ بارش

سے بچانے کے لیے میں ایک چھاتا لے کر اُس کے پاس گیا۔ اس نے میرا بازو پکڑ کر اپنے جسم سے لپیٹ لیا اور اپنے چہرے کو میری طرف اٹھایا۔ میں نے بڑی تیزی اور نرم روی سے اُس کے ہونٹوں کا بوسہ لے لیا۔ اس کے ہونٹوں میں پانی کی بوندوں کا ایک سوندھا سا مزا تھا۔ ایسی شاندار بوندا باندی میں پانی سے شرابور وہ مجھے وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔

دوسرے دن میں نے آواز سنی جیسے مجھے کوئی بلا رہا ہو۔ ''نونیم، مسٹر ٹونیم!'' لیکن مجھے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ چیری کے درخت سے کچھ دور پہلے وہ مجھے مل گئی۔ اس کے پیروں سے دبی ہوئی پیڑ کی چھالیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کی خوبصورت اور مضبوط رانوں کے بیچ کس کر دھوتی بندھی ہوئی تھی۔

''چیری ابھی پکی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ کبھی پکتی نہیں ہیں۔ لیکن مجھے ہری اور کھٹّی ہی پسند ہیں۔ کیا تم پیڑ پر چڑھ سکتے ہو؟''

''کاش میں اب بھی پیڑ پر چڑھ سکتا۔'' میں نے کہا۔

''میری دادی ماں کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہے اور وہ پیڑ پر چڑھ سکتی ہیں۔''

''مجھ میں دم خم نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ ساٹھ سال کی عمر میں بھی خطرہ مول لے سکتی ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

کوشش کی تو میں آسانی سے بینا کے پیچھے پیچھے پیڑ پر چڑھ گیا۔ لیکن نہیں سمجھتا تھا کہ شاخیں میرا وزن اُٹھا پائیں گی۔ اور میں پیڑ کے ایک گدّھے پر رُک گیا۔ میرا چہرہ بینا کی چھاتی کے قریب تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی کمر پر رکھا اور اس کی بانہوں کے اندر کے حصہ کو چوم لیا۔ اُس نے کچھ نہیں کہا اور اپنے ہاتھ کی مدد سے کچھ اور اوپر چڑھنے میں میری مدد کی۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی کمر میں ڈال دیا جس سے وہ میرے اور قریب آ گئی۔

چاند اپنے عروج پر تھا اور اس کی روشنی بلوط کے لمبے پیڑوں سے ہو کر کھڑکی کے پاس پڑ رہی تھی۔ اس رات جھینگر اور چمگادڑوں کی آوازیں تمھارے گاؤں کی وادی سے

آ رہی تھیں۔ لوگ ناچ گا رہے تھے اور ڈھول پیٹ رہے تھے۔ شاید کوئی تہوار تھا اور دعوت بھی تھی۔ کیا کل رات تم بھی گا رہی تھیں؟ تم جس طرح اپنے دوستوں کے ساتھ ناچتی گاتی اور ہنستی ہو کیا تم اس طرح میرے بارے میں سوچتی ہو۔ میں اس رات بالکل تنہا تھا اور تمھارے علاوہ کسی کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔

بینا۔۔۔ میں نے کئی بار تمھارا نام پکارا۔ میں تم سے کہنا چاہتا تھا کہ میں تمھارے ساتھ پہاڑیوں پر چاند کی روشنی میں گھومنا چاہتا ہوں۔

آج کی رات باہر بہت سی روحیں بھٹک رہی ہیں جو خاموشی سے پیڑوں میں داخل ہو جاتی ہیں اور کھڑکی کے اردگرد دغبار اڑاتی ہوئی جہاں میں بیٹھتا ہوں وہاں چکر لگاتی رہتی ہیں۔ پیڑوں پر اور پرانے گھروں میں یہ عام طور پر رہتی ہیں۔ اس جگہ ایک بوڑھی عورت کا انتقال ہوا تھا۔ وہ اس گھر میں پچھلے تیس برس سے رہتی تھی۔ اُس کا وجود کہیں نہ کہیں یہاں موجود ہے۔ میری نگاہ جب اس کے لمبے سے شیشے پر گئی مجھے اُس کے چہرے کی بھی جھلک محسوس ہوئی۔ پیلاہٹ مائل لمبا چہرہ، سنہری بال۔ شاید اس کے گھر کی مالک مجھے پسند کرتی ہے اور مجھ پر مہربان ہے۔ بینا کیا وہ تم سے جلنے تو نہیں لگی۔

گانے بجانے کی آواز تیز تر ہوتی گئی۔ اس آگ کی روشنی میں، میں تمھارے چہرے کی چمک دمک اور تمتماہٹ، آنکھوں کی چمک اور مسکراہٹ کا تصور کرتا رہا۔ تمھارے پاس وہ سب لوگ تھے اور میرے پاس صرف آئینہ ہے، جس میں ستارے، چمگادڑ اور بھوت پریت تھے۔

صبح سویرے اُٹھا تو دیکھا کہ گھاس پر شبنم کے قطرے تازہ تھے، میں گھومتا ہوا نیچے جھرنے پر پہنچا اور پھر ایک چھوٹے سے ٹیلے پر چڑھ گیا، جہاں چیڑ کے پیڑ تنہا بڑی شان و شکوہ کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے اور ہوا آہستہ روی کے ساتھ ان کی شاخوں سے گزر رہی تھی۔ یہ میری پسندیدہ جگہ تھی جہاں بیٹھ کر مجھے ایک مخصوص قسم کی طاقت کا احساس ہوتا تھا اور کبھی کبھار یہاں بیٹھ کر اپنے آپ میں تازگی محسوس کرتا تھا۔ یہاں میں گھاس پر بیٹھ کر خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔ نیل فام آسمان میرے ساتھ جھولا جھول رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر

باز اُڑان بھر رہے تھے۔ پیڑوں کے درمیان مجھے اُس کی آواز سنائی دی۔ میں نے اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا تو وہاں پر وہ موجود نہیں تھی۔

میں اپنی عقل وفہم پر فخر محسوس کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جذباتی ہو کر محبت میں ڈوب جانا کوئی عقلمندی نہیں ہے۔ حالانکہ بار بار میں یہی سوچتا تھا کہ میرے اور اُس کے درمیان ایک جسمانی دلکشی ہے اور یہ بات بھی طے شدہ تھی کہ بینا کے بارے میں میری سوچ اس طرح کی نہیں تھی جیسی دوسروں کے لیے تھی۔ کیونکہ sex اب میرے لیے تفریح یا جشن سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ میرا اس سے جی بھر چکا تھا اور اب تبدیلی کی خواہش اور خواہشات کو بھولنے کی تمنّا کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

بینا کا انداز کچھ الگ تھا۔ جنگل میں ایک خوابیدہ پری کی طرح وہ پرانے پیڑوں نئی اور تازہ گھاس پر اور بھوت پریت زدہ چٹانوں کے قریب گھومتی رہتی اور اُن سے کچھ نہ کچھ حاصل یا محسوس کرتی۔ بچپن ہی سے معصوم۔ گزرتے ہوئے وقت اور حادثات سے بے نیاز — پہاڑوں اور جنگلوں سے قریب، اس طرح کی زندگی نے اس کو جادوئی اور طلسماتی بنا دیا تھا۔

تیسرا چوتھا اور پانچواں دن بھی گزر گیا اور وہ پہاڑی پر نظر نہیں آئی۔ محبت کے کرب اور مایوسی کی حالت میں، میں اُس کو تلاش کرنے کے لیے یہ سوچتا ہوا نکل پڑا کہ کیا وہ کہیں چلی گئی ہے اور اُس نے مجھے بھلا دیا؟ کیا ہم دونوں کو کسی نے ایک ساتھ دیکھ لیا اور اُس کو گھر میں بند کر دیا؟ یا وہ بیمار ہو گئی ہے؟ یا اُسے کوئی پری اڑا کر لے گئی؟

میں بڑی مشکل سے اس کے گاؤں پہنچا اور اس کے بارے میں دریافت کیا۔ ایک لڑکے نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی ماں کے گاؤں چلی گئی ہے جو تقریباً سو میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کا گاؤں پہاڑی کے بالکل سامنے تھا، جہاں کے مکانوں کی چھتیں سلیٹ کے ٹکڑوں سے بنی ہوئی ایک چھت کی طرح سیدھی دکھائی دے رہی تھیں۔ چہرے بہت چھوٹے اور بہت دور دکھائی دے رہے تھے جن کو پہچاننا مشکل تھا۔

اس طرح میں کڑھتا ہوا بے اطمینانی کی حالت میں اوک کے پیڑ سے ہو کر چڑیوں

کے گلے سے نکلنے والی شیریں اور فاختاؤں کی میٹھی آوازیں سنتا ہوا گزرا۔ قدرتی مناظر سے میں ہمیشہ خوش ہوتا تھا۔ لیکن غم زدہ احساسات میرے اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں حالات سے تھکا ماندہ اور پریشان تھا۔

مجھے وقت کے گزرنے کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔ سالہا سال گزرتے جا رہے تھے اور میں تنہائی محسوس کر رہا تھا بالکل اُس ساحل کی طرح جسے لہریں چھوڑ کر گزر جاتی ہیں اور ساحل تنہا رہ جاتا ہے۔ اسی لمحہ پرندوں کی آوازوں نے مجھے چونکا دیا جیسے وہ آوازیں کہہ رہی ہوں صرف میں اور تم ہی رہ گئے ہیں اور وقت گزر گیا۔

میں نے خود کو اس تخیلاتی دنیا سے باہر نکالا اور گاؤں سے دور پہاڑی راستوں اور جنگلوں سے قطع نظر میں نے اپنے آپ کو کام میں مصروف کر لیا اور معروضی انداز میں سوچنا شروع کر دیا اور کلسی میں لوہے کے بنے ہوئے ستونوں پر کندہ کتبوں پر ایک عالمانہ اور معنی خیز مضمون لکھا۔

لیکن رات ہوتے ہی بینا کا تصور میرے ذہن و دِل پر طاری ہو گیا۔ مجھے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ میں نے بجلی جلائی تو شیشے میں بینا کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ لیکن اب یہ چہرہ بوڑھی عورت کی شکل اختیار کر چکا تھا جو بہت دیر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

●●●

اور وقت گزر گیا

پریم کے لڑکے آدمی کی طرح لمبے اور صحت مند ہوتے جا رہے تھے۔ اُن کی موت کے بارے میں کیسے سوچا جا سکتا ہے جبکہ وہ تندرست اور توانا جوان تھے۔ انھیں دیکھ کر مجھے سومی اور دلجیت یاد آ گئے۔ وہ تقریباً انھیں کے ہم عمر تھے۔ میں انھیں دہرہ دون میں اسکول کے زمانے سے جانتا تھا۔ سومی اور دَل کی موت ایک بار پھر میرے ذہن میں تازہ ہو گئی۔ دل کا تو نوجوانی میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ میں نے پریم کے لڑکوں پر ایک نظر ڈالی تو ان دونوں کی یادیں تازہ ہو گئیں کہ وہ اتنی جلدی اس دنیا کو چھوڑ کر چلے گئے۔ کاش میں کچھ عرصہ ان کے ساتھ رہ سکتا۔

سومی اور دَل۔۔۔ مجھے یاد ہے کہ بارش ہو رہی تھی۔ بارش کا پانی پہاڑیوں پر بہہ رہا تھا۔ ہوا میں پانی کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ میں واپس آنے کے بجائے جھاڑ جھنکاڑ کو ہٹاتا ہوا پتوں کے درمیان بیلوں سے نکلتا ہوا گھومتا پھرتا گھنے جنگل میں جا پہنچا۔ وہاں مجھے پہاڑی کی تہہ میں پانی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ اس جگہ کا پتہ لگائے بغیر واپس جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

میں ایک چکنی چٹان سے پھسلتا ہوا ایک گھاٹی میں جا گرا جہاں مجھے ایک جھرنا ملا جس کا پانی چھوٹے پتھروں سے بہتا ہوا گزر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے جوتے اور موزے اُتارے اور جھرنے کے پانی میں اُتر گیا۔ پہاڑی کی طرف سے پانی ٹپک رہا تھا۔ پہاڑی

پر جنگلی پھول اور گھاس وغیرہ تھی اور اس کی اونچائی سائے کی طرح کھائی پر پڑ رہی تھی۔ چٹانیں چکنی اور صاف ستھری تھیں۔ ان میں کچھ پیلی اور بھورے رنگ کی تھیں۔ مستقل پانی کے گرنے سے پول میں گڈھے پڑ گئے تھے اور پانی نیچے تک گر رہا تھا۔ میں وہاں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرا، کیونکہ پانی سال کے درخت سے ٹپ ٹپ کر رہا تھا اور میں اپنے ساتھیوں کو اس پول کے بارے میں بتانے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

عام طور پر سومی نئی جگہوں کی تلاش کرتا تھا۔ پہلے تو ہم سب لوگ اس جگہ کے بارے میں سوچتے تھے لیکن بعد میں اس کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے۔ لیکن دلجیت اور سومی نے اس جھرنے کو تلاش کرنے کا سہرا میرے ہی سر باندھا تھا کیونکہ یہ تالاب میں نے تلاش کیا تھا۔

اس تالاب کی وجہ سے ہم لوگ وہاں پہنچے تھے۔ ہم نے اس تالاب کو پردۂ خفا میں رکھا تھا اور کسی کو اُس کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ سومی بہت اچھا تیراک تھا۔ وہ چٹان سے غوطہ لگا کر پانی کے اندر سنہری مچھلی کی طرح دور تک تیرتا ہوا چلا جاتا تھا۔ دل اس کے مقابلے میں زیادہ اچھا تیراک نہ تھا۔ میں بھی غوطہ لگاتا لیکن عام طور پر جلدی واپس آ جاتا تھا۔

چمکتی ہوئی چھوٹی مچھلیاں پانی میں بہہ رہی تھیں۔ پہلے تو ہم نے انھیں کانٹے سے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ کانٹے میں لگے ہوئے چارے کو کھا کر بھاگ جاتیں۔ پھر ہم ایک بڑی سی چادر لے کر آئے اور تالاب میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ڈال دی۔ لیکن مچھلیاں اس کے بھی قریب نہیں آئیں۔ آخر کار سومی ایک ڈائنامائٹ لے کر آیا اور اس نے ہمیں بتائے بغیر پانی میں دھماکہ کر دیا۔ اچانک دھماکے سے ہم لوگ گھبرا گئے اور ایک لمحہ کے لیے تو کان بہرے ہو گئے۔ پہاڑی کا کچھ حصہ تالاب میں گرا اور سومی بھی نیچے گر پڑا۔ ہم نے اسے سنبھالا۔ اس دھماکے کی وجہ سے کچھ مچھلیاں آئیں لیکن اتنی چھوٹی تھیں کہ وہ کھانے لائق نہیں تھیں۔

یہ دھماکہ کرنے کے بعد سومی کے ذہن میں ایک نئی بات آئی کہ تالاب کے آخری

کنارے پر ایک پشتہ بنا دیا جائے، جو میری اور دل کی مدد سے تیار کر دیا گیا۔ لیکن ایک روز شام کو بہت تیز بارش ہوئی اور پانی کے تیز بہاؤ سے پشتہ وغیرہ تباہ ہو گیا اور پانی کے ساتھ ہمارے کپڑے بھی بہہ گئے، کیونکہ ہم تالاب میں ننگے ہی نہایا کرتے تھے۔ ہم لوگ رات ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ ہم نے سوچا کہ اندھیرے میں گلی کوچوں سے نکل کر کسی طرح چھپ کر گھر پہنچ جائیں کیونکہ غلطی تو ہو ہی گئی تھی۔ ہم لوگ تالاب کے کنارے پڑی ہوئی ریت پر اچھل کود مچاتے اور کشتی لڑتے اور بھینسوں پر سواری کرتے۔ جو بھینسیں تالاب پر پانی پینے اور کیچڑ میں کھیلنے آتی تھیں، ان کی پیٹھ پر بیٹھ جاتے اور انھیں ہانک کر آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن وہ آگے نہیں کھسکتی تھیں، زیادہ سے زیادہ وہ تالاب میں بھری ہوئی کیچڑ تک لے جاتی تھیں۔

بھینسوں کو آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ زمین کا ایک طاقتور جانور ہے جو عموماً گرمی کے دنوں میں ٹھنڈی اور نرم کیچڑ میں رہنا پسند کرتا ہے۔ بھینسوں کو مٹی میں لت پت یا اُن کے منہ میں بھری ہوئی گھاس دیکھ کر جس سے وہ جگالی کرتیں، بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ سوئی ہوئی نیم وا آنکھوں سے دیکھتیں اور کوؤں کا چونچیں مارنا بھی برداشت کرتی تھیں۔ وہ شاید ہر وقت یہی سوچتی تھیں یا مٹی اور کیچڑ کی نرمی سے محظوظ ہوتی تھیں اور ہمیں سورج کی تمازت سے پسینے آ جاتے تھے۔ بھینس جیسے کاہل جانور سے جفاکشی اور محنت کی امید نہیں کی جا سکتی۔ گردن کو پانی میں ڈبائے رکھنا ہی ان کی زندگی کا مقصد ہے۔

ہم کیچڑ اور مٹّی کی پروا کیے بغیر کیچڑ میں غوطہ لگاتے اور پھر ایک دم ہی گندگی سے باہر آ جاتے۔ کیچڑ میں کھیلنا ہمارا شوق تھا اور ہم برف کی گیند کے بجائے مٹی کی بال بنا کر اس سے کھیلا کرتے تھے۔

سومی اور دل رات کو چپ کر گھر سے نکل آتے اور ہم سب مل کر چاندنی رات کی خاموشی میں نہاتے کیونکہ رات کے سناٹے میں یہ سب کچھ آسان تھا۔

معلوم نہیں یہ سب کچھ کیسے ہوا مجھے ٹھیک سے یاد بھی نہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ ہم لوگ ہمیشہ کے لیے الگ ہو گئے اور وہ تالاب ہم دوبارہ دیکھ بھی نہیں پائیں گے۔ تقریباً

ایک سال بعد سومی نے میٹرک پاس کر کے ملٹری اکیڈمی میں داخلہ لے لیا۔ پچیس سال پہلے میں نے اُسے آخری بار دیکھا تھا جب وہ کمیشن کی تیاری کر رہا تھا۔ ان دنوں اس کی مونچھیں تھیں اور وہ ایک ہونہار نوجوان دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اس تالاب کو بڑے جذباتی انداز میں یاد کیا لیکن اس طرح نہیں جیسے میں یاد کرتا تھا۔ قصہ کوتاہ، سومی نے میٹرک پاس کر لیا۔ دِل اور اُس کے گھر والے شہر چھوڑ کر چلے گئے۔ انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد ہی میں دوبارہ اس سے مل سکا۔ وہ ائیر فورس کی یونیفارم پہنے ہوئے لمبا چوڑا خوبصورت نوجوان پہچان میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی گول مٹول چھوٹا بچہ ہے جو کبھی میرے ساتھ تالاب پر کھیلا کرتا تھا۔ اس سے ملنے کے تین ہفتہ بعد میں نے سنا کہ وہ ہوائی جہاز کے حادثہ میں مر گیا۔

پیارے دِل۔۔۔ آج بھی میں تمھیں اپنے دل کے قریب پاتا ہوں اور اُنھیں دنوں کو یاد کرتا ہوں جب ہم پہلی بار ملے تھے۔ میں نے یہ ڈائری 1951 میں لکھی تھی۔ اُس وقت میری عمر سولہ سال تھی اور تم تیرہ یا چودہ سال کے رہے ہو گے۔

یہ 7 ستمبر کا واقعہ ہے۔ سومی نے مجھ سے پوچھا تھا کیا تمھیں ہاتھی پسند ہیں؟

''ہاں۔ لیکن جب وہ پالتو ہوں۔''

''ٹھیک ہے دلجیت، چلے آؤ رسکن کو ہاتھی پسند ہیں۔'' سومی نے کہا۔

''دِل کوئی ہاتھی نہیں ہے۔ وہ ہم میں سے ایک ہے۔''

''وہ موٹا ہے۔ لیکن عادتیں کچھ ہاتھی کی طرح ہیں۔ اُس کا موٹاپن زیادہ برا بھی نہیں لگتا۔ اگر وہ پتلا دبلا ہوتا تو شاید اتنا اچھا نہیں لگتا۔''

اس کی چمکتی ہوئی شرارتی آنکھیں بڑی خوشنما لگتی ہیں۔ اور وہ تالاب۔

اُس تالاب کو میں نے تمھیں سال کی مدت گزرنے کے بعد تلاش کیا لیکن وہ پہلے کی طرح نہیں ملا۔ وہاں کائی تھی اور کچھ پتھر پڑے ہوئے تھے۔ پانی تو ختم ہو چکا تھا۔ پانی نے اپنا راستہ بدل لیا تھا، جیسے ہم بدل گئے تھے۔

یہ دیکھ کر مجھے بہت مایوسی ہوئی اور دل میں ایک درد سا ہوا۔ وقت کی ستم ظریفی دیکھیے

کہ تالاب ہی وہاں سے غائب ہو گیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر مجھے پانی بہنے کی اور بچوں کے شور وغل کی آواز سنائی دی اور میں جنگل میں اس طرف چل دیا۔ وہاں میں نے ایک دوسرا نیا تالاب دیکھا اور تقریباً آدھا درجن بچے پانی میں کھیل کود رہے تھے۔

بچوں نے مجھے نہیں دیکھا اور میں پیڑ کے پیچھے چھپ کر انھیں دیکھنے لگا۔ دراصل میری آنکھیں دلجیت، سومی اور بھینسوں کو تلاش کر رہی تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک میں وہاں کھڑا رہا۔ بچوں کی اندھا دھند بھاگ دوڑ سے میرے ذہن میں ماضی کا وہی تصور ابھر آیا جب ہم اس تالاب پر کھیلا کرتے تھے، جس کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں تھا۔ حقیقت میں کچھ بھی نہیں بدلا تھا اور وقت بھی اپنی جگہ ساکت ہی تھا۔

●●●

ابتدائی کہانیاں

دن کے وقت نظروں سے اوجھل گاؤں کی طرف سے آنے والی دھواں دھواں سی ہوا، جلی ہوئی لکڑیوں اور اُپلوں کی مہک، تل کی جھاڑیوں سے ٹپکتی بوندیں اور چیڑ کے درختوں کی سڑی ہوئی تیلیوں سے اُڑتی ہوئی خوشبو۔ یہی ہے ہمالیہ کی اصل معطر فضا کہ ایک بار کسی انسان کے خون میں سرایت کر جائے تو وہ انسان دنیا و مافیہا کو بھول کر ان پہاڑوں میں ابدی نیند سونے کے لیے لوٹ آتا ہے۔

(Rudyard Kipling – رڈیارڈ کپلنگ)

ستمبر کی وہ پہلی تاریخ تھی۔ برسات کے ختم ہونے پر میں چیڑ کے پیڑوں سے بھرے ہوئے اس ٹیلے پر گیا جہاں میں اکثر سکون و قوت حاصل کرتا ہوں۔

کئی مہینوں کے بعد میرا اِس جگہ آنا ہوا تھا۔ میں اپنے مسائل میں گھرا میدانوں میں گھومتا رہا۔ لوگوں سے ملا اور ان کی پریشانیوں میں الجھا رہا۔ غرضیکہ برسات کا موسم پری ٹبّا کے سامنے واقع چیڑ کے پیڑوں سے ڈھکی ہوئی اس پہاڑی اور میرے بیچ ایک رکاوٹ تھا اور اب میں برسات میں اُگی لمبی لمبی فرنوں، جھاڑیوں اور انار پر پھولوں سے لدی ہوئی بیلوں پر رپ رپ کرتا چل رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بنے ہوئے پل سے

ندی پار کر کے سیدھی چڑھائی چڑھتا ہوا چیڑ کے ان پیڑوں کی ڈھلان پر آ گیا تھا۔

پیڑوں نے مجھے دیکھتے ہی میری طرف اپنا رخ کر لیا۔ دور دراز برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں سے ہوا کا جھونکا اُس وادی میں آیا، شاہ بلوط کے پیڑ پر بیٹھی نیلی لمبی نوک دار دُم والی مینا ڈر کے مارے شور و غل کرتی اُڑ گئی اور ٹِڈّے ایک دم خاموش ہو گئے۔ یہ پیڑ مجھے بھولے نہیں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے اپنے سر جھکا دیے اور مجھے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔ چیڑ کے تین، شاہ بلوط کا ایک اور جنگلی شاہ دانے کے پیڑ مجھے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ میں اُن کے قریب گیا۔ ان کے تنوں کو ہاتھ سے چھو کر ان کا استقبال کیا۔ شاہ دانے کا تنا ہموار تھا، جبکہ چیڑ کے تنے نقش و نگار سے آراستہ تھے اور شاہ بلوط کا تنا کھڑا اور پیچ دار تھا۔ شاہ بلوط کا درخت سب سے اونچا تھا۔ اس کی شاخیں ہوا سے اتنی جھک گئی تھیں کہ تنا ہموار اور غیر متوازن لگ رہا تھا اور اُس فلسفی کی طرح کھڑا تھا جو اپنی پوشاک اور چہرے سے بے نیاز اپنا راز اور دانشمندی چھپائے ہوئے ہو۔ شاید اس نے بقا کا صیغۂ راز جان لیا تھا۔

شاہ بلوط اور چیڑ کے پیڑ مجھ سے زیادہ عمر کے ہیں اور برسوں سے کھڑے ہیں جبکہ شاہ دانے کا پیڑ پورے سات سال کا ہو گیا ہے کیونکہ اُسے میں نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔

ایک دن شاہ دانے کا بیج لے کر میں نے زمین میں گاڑ دیا اور وہاں سے چلا آیا اور اُس کے بارے میں سب کچھ بھول گیا۔ کچھ ماہ بعد لمبی لمبی گھاس کے بیچ وہ شاہ دانے کا پیڑ اُگ آیا۔ مجھے اس کے بچنے کی امید نہیں تھی۔ مگر اگلے دو سال میں وہ دو فٹ اونچا ہو گیا تھا۔ بکریاں اُس کے پتّے کھاتی رہتیں اور جب گھسیارے کی درانتی نے اُس کے تنے کو مجروح کر دیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مرجھا جائے گا لیکن وہ پھر سے تر و تازہ ہو گیا اور پہلے سے بھی زیادہ بڑا۔ تین سال کے اندر تنومند ہو کر وہ پانچ فٹ اونچا ہو گیا تھا۔

مجبوریِ حالات کی وجہ سے نوکری کی تلاش میں ان وادیوں کو چھوڑ کر میں دو سال کے لیے دہلی چلا گیا تھا۔ شاہ دانے کے پیڑ کو میں بھلا نہیں پایا اور اکثر اسے یاد کرتا رہتا اور

تذکیۂ نفس کے ذریعے حوصلہ افزائی کا پیغام اسے بھیجا رہتا۔ چند سال بعد خزاں میں جب میں واپس آیا تو اس پیڑ پر پیازی رنگ کے پھولوں کی بہار دیکھ کر میرا دل قلابازیاں کھانے لگا۔ (نومبر کے مہینے میں ہمالیہ پر شاہ دانے کے پھول واہ!) بعد میں جب اس کا پھل پک گیا تو طرح طرح کی چھوٹی چھوٹی چڑیاں اور بلبلیں اس کھٹے میٹھے پھل سے سیر ہونے کے لیے آنے لگیں۔

پچھلے موسم گرما میں، میں نے اس ٹیلے پر اسی شاہ دانے کے پیڑ کے نیچے گھاس پر سو کر رات بتائی تھی۔ گھنٹوں ندی کے پانی کے قل قل بہنے اور ابابیل کی ٹھک ٹھک کرنے کی آوازیں سنتا رہا۔ پیڑ کی شاخوں کے بیچ سے ستاروں کی رِم جھم دیکھا کرتا۔ زمین و آسمان اور اس چھوٹے سے شاہ دانے کے پیڑ کی طاقت کا اندازہ کرتا رہا۔

اور اب جب برسات ختم ہوگئی ہے تو میں اس جگہ کے سکون اور طاقت سے محظوظ ہونے کے لیے آ گیا ہوں۔ یہ دنیا کتنی وسیع ہے جہاں ہر وقت کچھ نہ کچھ عظیم تر ہوتا رہتا ہے۔ مگر اس ٹیلے پر یہ معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

یہی وہ جگہ ہے جہاں میں اپنی کہانیاں لکھوں گا۔ یہاں سے میں ہر چیز دیکھ سکتا ہوں۔ وادی کے اس پار اپنا گھر، اپنی پشت پر رِج کی بلندی پر بسا ہوا شہر، بازار اور سڑک جو عظیم دریا کے دہانے تک جاتی ہے۔ نیچے وادی میں بہتی ہوئی چھوٹی ندی اور گاؤں کو جاتی پگڈنڈی، سامنے پریوں کی رانی پہاڑی اور اس سے پرے کھیتوں کے نیچے چوڑی وادی اور پہاڑوں کا ایک اور سلسلہ اور ذرا دور میدانی علاقے میں ایک باغیچے میں پریم سنگھ کو دھوپ میں گدّے بچھاتے دیکھ رہا ہوں۔

یہاں سے پریم سنگھ پہاڑی پر محض ایک دھبّہ سا لگتا ہے۔ لیکن میں اس کے کھڑے ہونے کے انداز سے پہچان جاتا ہوں کہ وہ پریم سنگھ ہی ہے۔ آدمی سو طرح کے بھیس بدل لے مگر آخر میں اُس کا اُٹھنے بیٹھنے کا انداز اُس کی اصلیت ظاہر کر ہی دیتا ہے۔ میرے دادا بھیس بدلنے میں ماہر تھے اور بازاروں میں کبھی پھل فروش اور کبھی ٹوکریاں بیچنے والا بن جاتے تھے اور ہم انھیں ہمیشہ ان کے کمر کے نمایاں خم سے پہچان جاتے تھے۔ پریم سنگھ کی

کمر میں خم نہیں ہے اُس کی عادت اوپر آسمان میں تکنے کی ہے۔ (موسم چاہے صاف ہو یا بادل چھائے ہوں) اس وقت بھی وہ آسمان میں تک رہا تھا۔

آٹھ برس سے پریم سنگھ کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ میں نے اِس کو پہلی مرتبہ اُس وقت دیکھا تھا جب وہ سولہ سال کا لڑکا تھا۔ اب وہ بیوی بچے والا ہے۔

اس کانج میں آئے ہوئے مجھے ایک ہی سال ہوا تھا۔ وہ باورچی خانے کے باہر چبوترے پر کھڑا تھا۔ لمبا، کالی چمڑی والا لڑکا۔ سفید دانت اور بھوری گہری آنکھوں کا مالک، سفید موٹے سوتی کپڑے کی پوشاک پہنے جو شاید اس کے پاس اکیلا ہی جوڑا تھا۔ وہ نوکری کی تلاش میں آیا تھا۔ دیکھنے میں وہ مجھے اچھا لگا لیکن—

''میرے پاس کام کرنے کے لیے نوکر ہے۔'' میں نے کہا۔

''جی! وہ میرا چچا ہی تو ہے۔''

پہاڑی علاقوں میں ہر کوئی ایک دوسرے کا بھائی، چچا یا ماما ہوتا ہے۔

''تم اپنے چچا کو نوکری سے نکلوانا چاہتے ہو؟''

''نہیں صاحب! چچا کہہ رہے تھے آپ مجھے کہیں کام دلوا دیں گے۔''

''میں کوشش کروں گا۔ پوچھوں گا۔ ادھر ادھر۔ گاؤں سے ابھی آئے ہو۔''

''جی صاحب کل پوڑی تک دس میل پیدل چل کر اور وہاں سے بس سے۔''

''بیٹھو تمھارا چچا ابھی چائے لا کر دے گا۔'' وہ سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے سفید جوتے اُتارے اور پنجوں کو مسلا۔ اُس کے پاؤں خاصے بڑے اور چوڑے تھے۔ لیکن گندے نہیں تھے۔ اُس کا قد بھی دوسرے لڑکوں سے زیادہ لمبا بھی تھا۔

''سگریٹ بیڑی پیتے ہو؟ میں نے پوچھا۔

''نہیں صاحب۔''

''یہ سچ کہتا ہے صاحب یہ لڑکا بیڑی سگریٹ کچھ نہیں پیتا۔'' اس کے چچا نے کہا۔ ''میرے دوسرے بھتیجے بیڑی سگریٹ پیتے ہیں لیکن یہ تو نرالا ہی ہے۔ نہ بیڑی پیتا ہے نہ حقّہ۔''

''اور شراب؟''

''شراب کو دیکھتے ہی مجھے قے ہونے لگتی ہے صاحب۔''

''اور بھانگ؟''

''نہیں صاحب۔''

''تم نے کوئی بری عادت نہیں پالی۔ بڑی غیر قدرتی بات ہے۔''

''بالکل خلافِ عادت صاحب!''

''لڑکیوں کے پیچھے بھاگتا ہوگا؟''

بلکہ لڑکیاں اس کے پیچھے بھاگتی ہیں جناب۔''

''تو یہ گاؤں چھوڑ کر نوکری کی تلاش میں کیوں آیا ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا دوسری طرف دیکھنے لگا اور اپنے پاؤں رگڑنے لگا۔

''تمھارا نام۔''

"پریم سنگھ۔''

''ٹھیک ہے پریم سنگھ، میں تمھارے لیے کام تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔''

چند ہفتوں تک میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں اس کے لیے کام تلاش کرنا بھول ہی چکا تھا لیکن جب میں اُس سے بازار جاتے ہوئے سڑک پر ملا تو اس نے بتایا کہ اسے عارضی طور پر پیائش کے دفتر میں نوکری مل گئی ہے۔ امین پیائش کے ٹینٹوں کی رکھوالی کرنی ہوگی۔

''اگلے ہفتے ہم راجستھان جا رہے ہیں۔'' اُس نے بتایا۔

''وہاں تو بہت گرمی ہوگی۔ تم پہلے بھی ریگستان میں گئے ہو؟''

''نہیں صاحب۔''

''وہ علاقہ پہاڑوں جیسا نہیں ہے۔ اپنے دیس سے دور بھی ہے۔''

''جانتا ہوں صاحب۔ لیکن میرے پاس اور چارہ بھی تو نہیں ہے۔ شادی کے لیے مجھے کچھ روپیہ اکٹھا کرنا ہی ہے۔''

یہاں پہاڑوں پر دلہن کی قیمت چکانی ہوتی ہے۔ یہی کوئی دو ہزار روپیہ۔

''تم جلدی ہی شادی رچانے والے ہو؟''

''میرا ایک بھائی اور بھی ہے۔ وہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔ ماں اکثر بیمار رہتی ہے۔ کھیتوں میں کام کرنے اور گھر میں گایوں کی دیکھ بھال میں اُس کا ہاتھ بٹانے کے لیے بہو تو چاہیے۔ صاحب ہمارا چھوٹا سا گھرانا ہے مگر کام زیادہ ہوتا ہے۔''

یہاں ہر کسی کے پاس ندی یا دریا کے پاس بلند مقام پر چند چھوٹے اور پتھریلے کھیت ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی گزر کے لیے چاول، جو، مکّا، آلو وغیرہ کی کھیتی کرتے ہیں۔ اگر فصل زیادہ ہو بھی جاتی ہے تاہم سڑکوں کی کمی کی وجہ سے شہر کی منڈیوں میں پہنچ نہیں پاتی۔ گاؤں میں آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا اور روپے پیسے کی ضرورت، کپڑے لتّے، صابن، دوادارو اور ساہوکار کے پاس رہن رکھے زیورات چھڑوانے کے لیے پڑتی ہے۔ اس لیے نوجوان لوگ گاؤں چھوڑ کر شہروں میں نوکری کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ کچھ خوش قسمت فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں۔ کوئی گھر میں یا گیراج میں، ہوٹل میں یا سڑک کے کنارے چائے کی دکان یا اسکول میں نوکری کرنے لگتا ہے۔ مسوری میں اسکولوں کی تعداد زیادہ ہے اس لیے یہاں خانساموں اور بیروں کی ضرورت رہتی ہے۔ مگر پریم جب آیا تو کہیں جگہ خالی نہیں تھی۔ فوج میں بھرتی ہونے کی غرض سے وہ رُڑکی میں بھرتی دفتر میں گیا۔ داہنے پاؤں میں نقص ہونے کی وجہ سے اُسے فوج میں نہیں لیا گیا۔ برسات کی ایک اندھیری رات کو پہاڑ کے ایک ٹکڑے کے گرنے سے اس کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ خود کو خوش قسمت کہتا تھا کہ پاؤں پر ہی چوٹ لگی اور اس کا سر بچ گیا۔

نوکری کے بارے میں اپنے چچا کو بتانے اور اسے الوداع کہنے آیا تھا۔ آدمی اچھا ہے شاید پھر اس سے ملاقات نہ ہو، میں نے سوچا۔ ایسے لگا جیسے رات کے وقت ایک اور جہاز اُڑا جا رہا ہو اور اس کی ٹمٹماتی روشنی اندھیرے میں غائب ہوگئی ہو۔ ''آنا پھر'' میں نے اس کی مسکراہٹ میں اپنی مسکراہٹ کو تحلیل کرتے ہوئے کہا اور اپنے پڑھنے کے کمرے میں ٹائپ کی مشین پر کام کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ ٹائپ کی مشین تنہائی میں ایک

ادیب کے لیے مخزن ثابت ہوتی ہے۔ وہ ہر روز اُس کے پیچھے بے دردی سے اس کی ہمت توڑنے کے لیے دیکھتی ہے۔ ممکن ہے مجھے پھر وہی پَر والے قلم اور سنگ مرمر کی دوات کا سہارا لینا پڑے۔ تبھی میں رات بھر قلم گھستا ہوا بالذاک اور ڈکنس کی طرح اچھا ادیب بن سکوں گا۔۔۔ دن اور رات بے شک ظاہراً چھوٹے ہوتے ہیں، ورنہ ہم ہر کام اتنی جلدی میں کیوں کر لیتے ہیں اور پرانے زمانے کے مقابلے میں زیادہ نہیں کر پاتے۔

پریم چلا گیا اور میدانوں سے بھرے بھونڈے شہروں میں گم ہو گیا۔ اُسے گئے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا یا شاید میں ہی گم ہو گیا تھا کہ وہ پہلے سے کمزور اور سیاہ چہرہ لیے ہوئے مسکراتا ہوا پھر وہی نوکری کی تلاش میں نمودار ہوا۔ مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ پہاڑی لوگ ہمیشہ کے لیے غائب نہیں ہو جاتے۔ یہاں کی روحانی چٹانیں اپنے لوگوں کو زیادہ دیر تک گم نہیں ہونے دیتیں مبادا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ان کو کھو بیٹھیں۔

کوشش کر کے میں نے پریم سنگھ کو ایک اسکول میں لگوا دیا۔ ہیڈ ماسٹر کی بیوی کو ایک خانساماں کی ضرورت تھی۔ پریم اچھا کھانا بنا سکتا تھا مجھے اس کا یقین نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے اُسے بھیج دیا اور انھوں نے اس کو آزمائش کے طور پر رکھ لیا۔ تین دن بعد ہیڈ ماسٹر کی بیوی سڑک پر مجھے مل گئی تو وہ بہت خوشی سے ملی۔ دراصل وہ ایسی ہی عورت تھی۔

''ہم آپ کے بے حد شکر گزار ہیں جو آپ نے اتنا اچھا لڑکا ہمارے پاس بھیجا ہے۔ وہ بہت اچھا کھانا بناتا ہے جو میرے خاوند کے لیے تو ذرا گرم ہوتا ہے مگر ہوتا ہے بڑا ذائقہ دار اور بڑا لذیذ! بڑے کام کا آدمی ہے یہ لڑکا۔'' اس نے مجھ پر ایک ٹیڑھی نگاہ ڈالی ایسی نگاہ جس سے وہ ہر خوبصورت لڑکے کو اپنا فریفتہ بنا لیتی تھی۔ وہ لڑکا جو اس کی سفارش پر خلیفہ یا مانیٹر بنا دیا جاتا تھا۔

اِس بات کا مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ اسے فقط خانساماں کی ہی ضرورت نہیں تھی بلکہ کچھ اور بھی چاہیے تھا۔ میں تو صرف یہی چاہتا تھا کہ پریم سنگھ اس کی ہر طرح سے تسلی کر دے۔

چھٹی کے روز جب دو میرے پاس آتا تو میں اسے خوش پاتا۔

''کیسے چل رہا ہے؟'' میں پوچھتا۔

''بہت اچھے۔'' اپنی مالکن کے سے انداز میں وہ کہتا۔

'اچھے سے تمھارا کیا مطلب ہے۔ تمھیں اپنا کام تو پسند ہے نا؟''

''میم صاحب کو تو میرا کام پسند ہے صاحب۔ رسوئی گھر میں آتی ہیں تو میرے گالوں پر چٹکی بھر لیتی ہیں۔ صاحب تو کچھ نہیں بولتے۔ ان کو تو کھانے کے بعد فقط دوا ہی چاہیے۔''

''دوا وہ پہلے سے لے رہے تھے یا تب سے جب سے تم کھانا بنانے لگے ہو؟''

''یقین سے تو کہہ نہیں سکتا صاحب۔ شاید وہ پہلے سے ہی لے رہے تھے۔''

پریم سنگھ ہیڈ ماسٹر کے برآمدے میں ہی سوتا تھا اور اُسے ساٹھ روپے ماہوار ملتے تھے جبکہ دہلی میں ایک خانساماں کو ایک سو ساٹھ روپے ملتے ہیں اور نیویارک اور پیرس میں تو اس سے دس گنا زیادہ۔ یہ بات میں نے پریم سنگھ سے نہیں کہی ورنہ وہ مجھے نیویارک میں نوکری دلانے کے لیے کہتا اور اس کے بعد میں اس سے کبھی نہ مل پاتا جبکہ میں ادیب ہوتے ہوئے بھی اکیلے صدر کیمپ تک بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس راز کو میرے چچا کین ہی سمجھتے تھے کہ کام کیے بنا روپیہ کیسے کمایا جا سکتا ہے۔ اُن کی چار بہنیں تھیں۔ سبھی امیر گھرانوں میں بیاہی ہوئی تھیں۔ چچا کین نے اپنا وقت بانٹ رکھا تھا۔ تین مہینے وہ نینی تال میں روبی آنٹی کے پاس، دوسرے تین مہینے کشمیر میں سوسی آنٹی کے پاس، اگلے تین مہینے میری امی کے پاس جام نگر میں (وہ اتنی مالدار نہیں تھیں) اور رآخری تین مہینے بریلی میں جانوروں کے ہسپتال میں بڑی آنٹی میبل کے پاس جو ہسپتال چلا رہی تھیں، وہ رہتے تھے مگر ایسی جگہ وہ زیادہ نہیں ٹکتے تھے، جہاں ان کا خوشی سے استقبال نہیں ہوتا تھا۔ کوئی بھی بہن اپنے بھائی کی تین مہینے سے زیادہ خاطر تواضع نہیں کر سکتی تھی اور چچا کین بڑے سلیقے سے یہ پروگرام نبھا رہے تھے۔

مجھے افسوس ہے کہ میری کوئی بہن نہیں تھی اور میں ایک ناول سے ملنے والے معاوضے پر گزارہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے مجھے کچھ اور بھی لکھنا پڑتا تھا جس کے لیے میں یہاں پہاڑوں پر آ جاتا ہوں۔

''پریم، تم میرے ہاں کیوں کام نہیں کرتے؟'' میں نے کہا۔

''میرے چچا کہاں جائیں گے صاحب؟''

''وہ تو مجھے کبھی بھی چھوڑ کر جانے والا ہے۔ اُس کا دادا بیمار ہے اس لیے گھر جانا چاہتا ہے۔''

''اس کا دادا تو پچھلے برس مر گیا تھا۔''

''میرا مطلب ہے وہ جانے کے لیے بڑا بے چین رہتا ہے۔ اگر جانا چاہتا ہے تو چلا جائے مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔ آج کل ویسے بھی وہ بہت سونے لگا ہے۔ صبح کی چائے مجھے ہی اس کے لیے بنانی پڑتی ہے۔''

شاہ دانے کے پیڑ کی پتیاں زرد پڑنے لگی ہیں۔ میں اس کے سائے تلے گھٹنوں پر ٹھڈّی جمائے بیٹھا وادی کے اس پار پریم کو باغیچے میں مصروف پاتا ہوں۔ پچھلے سات سالوں میں جو اُس نے میرے ساتھ گزارے ہیں، اس کی بہت سی ناخوشگوار باتوں کو یاد کرتا ہوں۔ یہ باتیں سلسلہ وار تو میرے ذہن میں نہیں آتیں، بس یونہی یادداشت کی اسکرین پر رنگین سلائڈ کی طرح اُبھرتی ہیں۔

پریم کو میں اپنے ننھے سے بیٹے کو سلاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ وہ بچے کے گھنگھریالے بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا گنگناتا ہے۔☆ گرفتار کر کے جب مجھے پولیس اسٹیشن لے جایا جا رہا تھا تو وہ میرے ساتھ تھا اور باہر اُس وقت تک رُکا رہا جب تک میں پھر ظاہر نہیں ہو گیا۔ اُس کی وہ مسکراہٹ مجھے آج بھی یاد ہے جب وہ دہلی میں مجھ سے ملا تھا۔ لارل اور ہارڈی کی ایک پرانی فلم دیکھ کر وہ کیسے اپنی نہ رکنے والی زوردار ہنسی ہنس رہا تھا۔

بلا شک ایسے بھی موقعے تھے جب وہ غصہ میں آتا تھا۔ ضدی اور خودسر ہو کر مجھے چھوڑ جانے کی دھمکیاں دیتا۔ اُس نے مجھے زندگی میں بے حد پیار اور خوشیاں دی ہیں۔ ایک تن تنہا شخص کو اور بھلا کیا چاہیے؟

☆ ممبئی سے ایک وارنٹ، مجھ پر فحش کہانی لکھنے کا الزام تھا۔

اُس کی ضدی عادت نے ہی اسے ہیڈ ماسٹر کے ہاں زیادہ دن تک ٹکنے نہیں دیا۔ مسٹر گڈ تو خاصے روادار تھے لیکن بیگم گڈ اُن عورتوں میں سے تھی جو جب کسی پر خوش ہوتی تو بلا جھجک مدد کرتی، لاڈ پیار کرتی اور مسکا لگاتی اور جب ناراض ہوتی تو انتقام پر اُتر آتی اور ہر طرح نقصان پہنچانے کے لیے تیار رہتی۔ بیگم گڈ حکومت کرنا چاہتی تھی، اپنے خاوند پر، اپنے کتّے پر، اپنے چہیتے شاگرد پر اور نوکر پر۔۔۔ اپنے خاوند اور کتّے پر تو اُس کا کامل رعب تھا۔ شاگردوں پر جزوی اور پریم کو تو وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی، کیونکہ وہ اس کی موشگافیوں کو دل پر نہیں لگاتا تھا۔ وہ اس کے مادرانہ سلوک، رسوئی گھر میں اس کے گالوں پر چٹکی بھرنے، اُس کے ساتھ رگڑ رگڑ کر چلنے یا اس کی آنکھوں اور جسم کی تعریف کرنے سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ میم صاحب لوگوں کے قابل نہیں ہے اس لیے پتھر کی مورت بنا تندہی سے اپنا کام کرتا رہتا۔ اس وقت میم صاحب خود کو حقیر اور توہین زدہ سمجھتی۔ اُس کی چاہت نفرت میں بدل جاتی۔ اُس کی تعریف کرنے کے بجائے وہ اس کی آنکھوں، اس کے کپڑوں اور اس کی وضع قطع کا تحقیر آمیز انداز میں ذکر کرتی۔ اس کے کھانے میں نقص نکالتی۔ اب تو کھانا بالکل بے کار ہوتا ہے۔ وہ اس پر کتّے کی میٹ کو چرانے اور پہاڑ پر ایک غریب گھر میں دے آنے کا الزام لگاتی۔ اس سے زیادہ نفرت انگیز جرم کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مسٹر گڈ نے اسے نوکری سے نکال دینے کی دھمکی دی۔ پریم اور بھی ضدی ہو گیا۔ اگلے دن اُس نے کتے کو میٹ نہیں دیا اور گٹر میں پھینک دیا جسے کئی آوارہ کتے کھا گئے اور خود سنیما دیکھنے چلا گیا۔

یہ اس کی نوکری کے کھو جانے کا بہانہ تھا۔ ''مجھے اب گھر جانا ہے۔'' اُس نے مجھ سے کہا۔ ''میم صاحب کی مہربانی سے مجھے اس علاقے میں اور کہیں نوکری نہیں مل سکتی۔''

''کچھ دن رکو تو سہی۔'' میں نے کہا۔

''میرے پاس اتنی رقم ہے صاحب کہ گھر جا سکوں۔''

''اُسے گھر جانے کے لیے سنبھال کر رکھو۔ کچھ دن کے لیے تم میرے پاس ٹھہر کر نوکری تلاش کرتے رہو۔ کھانا تم اپنے چچا کے ساتھ کھا لینا۔ وہ برا نہیں مانے گا۔''

لیکن اس کے چچا کو یہ بات ناگوار لگی۔ اسے یہ پسند نہیں تھا کہ اپنے بھتیجے کی نوکری بچائے۔ اُسے اِس بات کا بھی ڈر تھا کہ کہیں پریم سنگھ ہی اس کی جگہ نہ رکھ لیا جائے۔

پریم سنگھ ہفتے بھر سے زیادہ میرے پاس نہیں ٹھہرا۔

ٹیلے پر اکتوبر کے مہینے میں گھاس زرد پڑنی شروع ہو جاتی ہے۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادل سردی کی آمد کی خبر دے رہے تھے۔ درختوں پر سکوت کا عالم تھا۔ پنچھی بھی چپ سادھے تھے۔ شاہ بلوط کے درخت پر فقط جھینگر ہی اپنے راگ میں مست تھا اور شام کو کسی طوفان کے اُٹھنے کی آگاہی دے رہا تھا۔ ایسے ہی طوفان میں پریم اپنی بیوی بچے کے ساتھ میرے پاس آیا تھا۔ بات تو یہ بہت آگے کی ہے۔

اُس کے گاؤں چلے جانے کے کئی مہینے بعد میں پھر اس سے ملا۔ اس کے چچا نے بتایا کہ دہلی میں کسی جگہ اس کی نوکری لگ گئی ہے۔ مجھے اس کا پتہ بھی دیا جو نامکمل تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اگلی بار جب میں دہلی جاؤں گا تو پریم کو ضرور ڈھونڈ نکالوں گا۔ مئی کا مہینہ تھا، جب میدانوں میں گرم لُو چلنے لگتی ہے۔ آسودہ حال لوگ تو پہاڑوں کا رُخ کرتے ہیں۔ نئی دہلی شہر مجھے کسی بھی موسم میں اچھا نہیں لگا اور موسم گرما سے تو مجھے شدید نفرت تھی۔ لوگ بڑے چڑچڑے اور گھٹیا مزاج کے ہو جاتے ہیں۔ لیکن مجھے تو دہلی جانا ہی تھا۔ نہ جانے کس وجہ سے۔ شاید اُس وقت میرا جانا ضروری تھا اور یہی موقعہ تھا کہ میں پریم کو ڈھونڈ سکتا تھا۔

بات کچھ بن نہیں رہی تھی۔ جو پتہ میرے پاس تھا غلط تھا۔ میں دو گھنٹے تک اِدھر اُدھر وسنت وہار میں گھومتا رہا، جہاں پیڑ پودوں کا نام نشان تک نہیں تھا۔ ہر طرف ریت ہی ریت تھی۔ جو بھی گھریلو نوکر مجھے ملتا میں اس سے پوڑی گڑھوال کے گاؤں کولی کے پریم سنگھ کے متعلق پوچھتا۔ پریم سنگھ نام کے کئی نوکر تھے۔ لیکن کولی گاؤں کا رہنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں لوٹ آیا اور دو دن تک مسوری لوٹنے سے پہلے

لُو کے اثر کو زائل کرتا رہا۔ شکر ہے خدا کا جس نے یہ پہاڑ پیدا کیے۔

پریم کے چچا نے مجھے نوکری چھوڑنے کا نوٹس دے دیا۔ دہرہ دون میں اُسے اچھی نوکری مل رہی تھی اور وہ بھی جانے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ میں نے بھی اُسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

اگلے چھ ماہ میں نے بنا کسی نوکر کے گزار دیے۔ مجھے کسی طرح کی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اکیلے رہنے کی عادت جو تھی۔ دراصل مجھے نوکر کی نہیں بلکہ ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ میری کاٹیج ہر طرح سے پرسکون تھی۔ مردہ لوگوں کی روحیں ہمدردی سے پیش آتی تھیں اور کسی طرح سے مخل نہیں ہوتی تھیں۔ سیٹی بجانے والے پرندے کا گیت میٹھا تھا لیکن وہ میرے لیے نہیں تھا۔ وادی سے پرے کہیں سے بانسری کی آواز آ رہی تھی اور بجانے والا کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میری اُنسیت لال لومڑی سے ہو گئی تھی جو کالج کے پاس گھومتی رہتی تھی۔ ایک رات اس کو جو دیکھا تو یہ چند لائنیں لکھ دیں۔

پچھلی رات گھر لوٹتے ہوئے دیکھا
ایک لومڑی کو ناچتے
چاند کی ٹھنڈی چاندنی میں
میں رُکا، دیکھا اور چھوٹی سڑک پر ہو لیا
میں جانتا تھا
اُس رات پر اُس کا حق ہے
کبھی کبھی الفاظ سچ بولتے ہیں
میں اس تنہا لومڑی کی مانند
صبح کی شبنم پر ناچتا ہوں

برسات کے موسم میں جب پیڑوں پر سے بوندیں ٹپکتی ہیں اور وادی سے دھند اُٹھتی ہے، میں خوب شاعری کرتا ہوں۔ تنہائی شاعروں کا سرمایہ ہے۔ لیکن شاعری نے مجھے

روپیہ پیسہ نہیں دیا جس کی میرے پاس کمی تھی اور جیسے ہی میں سوچ میں پڑا تھا کہ اپنی اس آزادی کو تیاگ کر پھر سے نوکری کرلوں کہ ایک ناشر بچوں پر لکھی کہانیوں کی پیپر بیک کتاب چھاپنے کے لیے میرے پاس آیا اور میں پھر اُس آزادانہ ڈھنگ سے تین ماہ تک لکھتا رہا۔

نومبر کا مہینہ تھا۔ کتاب کا جشن منانے کے لیے میں لنڈور بازار سے ہوتا ہوا ٹہری کی سڑک پر آ گیا۔ سیر کرنے کے لیے ماحول بہت اچھا تھا۔ جب میں شہر کی بیرونی حدود کے پاس پہنچا تو اچھا خاصا اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں نے کسی کو کاٹج کے پاس انتظار کرتے دیکھا۔ میں اُس کے پاس سے گزر گیا۔

میں خود کا نہ ہوا
تو کون میرا ہوگا
اگر میں اوروں کے لیے نہیں
کون ہوں میں؟
اب نہیں تو کب؟

قدیم ہیبر وسینٹ جلیل کے یہ بول سن کر میں چونک اٹھا۔ لوٹ کر اس جگہ آیا جہاں وہ نوجوان کھڑا تھا۔ دیکھا تو وہ پریم سنگھ تھا۔

''پریم تم یہاں ٹھنڈ میں باہر کیوں بیٹھے ہو اندر کیوں نہیں چلے گئے؟'' میں نے کہا۔

''گیا تو تھا صاحب پر وہاں تالا پڑا تھا۔ سوچا آپ کہیں گئے ہوں گے۔''

''یعنی تم سڑک پر ہی بیٹھے رہے؟''

''صرف آج رات کے لیے صبح کو دہرہ چلا جاؤں گا۔''

''آؤ۔ گھر میں چلیں۔ میں تمھارا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے تمھیں دہلی میں بہت ڈھونڈا لیکن تمھارا پتہ نہیں ملا۔''

''میں نے وہاں کی نوکری چھوڑ دی ہے۔''

''تمھارا چچا بھی چلا گیا ہے۔ تم میرے پاس کام کرو گے؟''

''جب تک آپ چاہیں صاحب۔''

ہم گھر کے اندر نہیں گئے اور بازار میں آ کر سندھی مٹھائی والے کی دکان پر کھانا کھایا۔ گرم گرم پوریاں اور گرم میٹھی چائے۔

ہم دونوں چاندنی رات کی روشنی میں پیدل گھر آئے۔ ننھی سی لومڑی کو اکیلے ہی ناچتے دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوا۔

یہ بات بیس سال پرانی ہے۔ پریم، اُس کی بیوی اور تین بچے آج بھی میرے پاس ہیں۔ اب ہم دوسری پہاڑی پر ایک اور مکان میں رہتے ہیں۔

●●●

مرگِ شجر

موسمِ سرما میں ایک دن میپل وڈ پہاڑی کی پرسکون فضا ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ حکومت نے پہاڑوں کے درمیان ایک نیا روڈ بنانے کا فیصلہ کیا۔ محکمۂ پی.ڈبلیو.ڈی نے میرے گھر کی بڑی کھڑکی سے چھ فٹ کے فاصلے پر سڑک بنانے کے لیے جگہ مناسب سمجھی جس کی وجہ سے پیڑوں کو کاٹنا پڑا۔

میں اپنے جرنل میں پیڑوں کو کاٹے جانے کا ذکر کر چکا تھا۔ کاٹے جانے والے پیڑوں میں پہلا پیڑ اخروٹ کا تھا جس کی نشوونما میں گزشتہ دس برسوں سے اسی طرح دیکھ رہا تھا جیسے پریم کے چھوٹے بیٹے راکیش کی..... میں نے اس پیڑ کی نئی پتیوں، کونپلوں، گرمیوں میں ہرے پتوں اور ستمبر میں ان کی نوکوں کو سنہری رنگ میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر اخروٹ پک کر زمین پر گرتے۔ یہ درخت ٹھیک میری کھڑکی کے پاس تھا جہاں روڈ پر ایک اونچا پشتہ لگا ہوا تھا۔

اس بڑے جنگل میں ایک بڑھتے ہوئے چھوٹے دیودار کے درخت کو بھی کاٹ دیا گیا۔ کچھ سال پہلے سورج کی روشنی نہ ملنے کی وجہ سے اس کی نشوونما رُک گئی تھی۔ شاہ بلوط کی گھنی شاخوں میں یہ چھپ گیا تھا اس لیے میں نے اس کی پھیلی ہوئی شاخوں کو کاٹ دیا تھا جس سے دیودار کی نشوونما اور تیز ہوگئی۔ اس کو بڑا ہونے سے پہلے ہی کاٹ دیا گیا۔ جیسے پچھلے ماہ میرا چھوٹا بھائی دہلی میں سڑک حادثے کا شکار ہوا۔ دونوں ہی سڑک حادثے

کا شکار ہوئے۔ دیودار کی موت پی.ڈبلیو.ڈی کے ذریعے ہوئی اور میرا بھائی سڑک حادثے سے فوت ہوا۔

میرے گھر کے قریب چھوٹی سی جگہ میں ہی شاہ بلوط کے بیس درخت گرا دیے گئے اور یہ سڑک دیکھتے ہی دیکھتے جبار کے کھیت تک پہنچ گئی جو یہاں سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ ایک ہزار سے زیادہ شاہ بلوط کے پیڑوں کے علاوہ بہت سے اچھے درخت جیسے چیڑ، میپل اور دیودار بھی ختم کر دیے گئے۔ زیادہ تر درخت تو بلاوجہ کاٹ دیے، حالاں کہ وہ روڈ سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر تھے۔

ان پیڑوں سے ٹھیکیدار کے علاوہ کسی کو کوئی پریشانی نہیں تھی جو ان کٹے ہوئے درختوں کو خریدتا تھا۔ یقین جانیے درخت اور جھاڑیاں کتنی ضروری ہیں۔

دودھ والے نے کہا کہ وہ راستے میں بہت خوشنما لگتے تھے۔

ایک کارآمد درخت جس کی صاف ستھری پتیاں چارے کے کام آتی تھیں وہ بھی کاٹ دی گئیں! اس نوجوان نے مجھے بتایا کہ کبھی پاوری آ کر دیکھو راستے میں اب کوئی درخت نہیں ہے۔ منظر بہت خوفناک لگتا ہے۔

ٹھیک ہے اب میں یہیں رہ کر اس تباہ کن پہاڑی کا نظارہ کروں گا لیکن دودھ والا اب چارے کے لیے کوئی دوسری جگہ تلاش کرے گا کیوں کہ شاہ بلوط کے پیڑ ختم ہو چکے ہیں۔

راکیش میپل کو تتلیوں والا درخت کہتا تھا کیوں کہ اس درخت کے جب پنکھ والے بیج اُڑتے تو وہ ہوا میں ادھر ادھر اڑتے ہوئے تتلیوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ اب نہ کوئی میپل باقی رہ گیا ہے، نہ چمکدار سرخ پتے آسمان کی جانب اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور نہ کوئی پرندہ۔

یوں سمجھ لیجیے کہ پیڑوں کے کٹنے کی وجہ سے گھر کے آس پاس کوئی پرندہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خوبصورت پرندے اور کبوتر شاہ بلوط کی ہری پتیوں میں پھڑ پھڑاتے تھے۔ لمبی دم والے چتلے کوے درختوں میں ادھر ادھر گھومتے رہتے تھے۔ دیودار کے پیڑ کی

چوٹی سے جہاں چڑیاں بسیرا کرتی تھیں چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سبھی پرندے جنگل چھوڑ کر کسی دوسری جگہ کی تلاش میں تھے۔

صرف کوے دکھائی دے رہے تھے جنھوں نے انسان کے پاس آنا جانا سیکھ لیا تھا اور جن کی تعداد گھروں اور سڑک کے پاس دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد بھی چاروں طرف کوّے ہی باقی رہ جائیں گے۔ اب صرف گزرتے ہوئے ٹرکوں کی گڑگڑاہٹ، ایک کونے میں چائے پکوڑے کی دکان، موٹر گاڑیوں کے ہارن اور بریک کی آوازیں، اب آوازیں ہی آوازیں تھیں۔

مسلسل دھماکوں سے پہاڑوں کا سکون ختم ہو گیا تھا۔ ہزاروں سال پرانی چٹانوں کو ڈائینامائیٹ سے اڑانے کی آواز سے بہادر پرندے اور جانور بھی ڈر کر بھاگ گئے، یہاں تک کہ نڈر لنگوروں کی بھی ہفتوں تک شکلیں دکھائی نہیں دیں۔

بہر حال ہمیں وہاں چائے کی کسی نئی دکان کے کھلنے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ اگلی پہاڑی پر جہاں ابھی سڑک نہیں نکلی تھی ایسی کئی جگہیں موجود تھیں جہاں نئی چائے کی دکان کھولی جا سکتی تھی۔ حالاں کہ میرا یہ سوچنا غلط ہی تھا اور ناکامی کی نشانی بھی، بالکل اسی طرح جیسے پیڑوں کا گرانا یا انھیں کاٹنا ان کی شان کے خلاف ہوتا ہے۔

بس ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں لیکن پہاڑ اپنی جگہ جامد و ساکت ہمیشہ قایم و دایم رہتے ہیں۔

●●●

جنون

تمہید

شدت کی گرمی پڑ رہی تھی جب ۱۰ مئی کو میرٹھ میں بغاوت ہو گئی۔ سپاہیوں نے اپنے ہی انگریز افسروں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ شہر میں بھی لوٹ مار مچی ہوئی تھی۔ جیل کے دروازے توڑ دیے گئے اور ہتھیار بند قیدی شہر اور چھاؤنی میں بسے ہوئے انگریزوں پر پل پڑے۔ اُن کے گھروں کو آگ لگا دی اور لوگوں کو قتل کر دیا۔ کئی باغی دستے دہلی کی طرف روانہ ہو گئے کہ وہی ان کے جمع ہونے کی جگہ تھی، جہاں امن پسند شاعر بادشاہ بہادر شاہ کو اچانک پھر نام نہاد شہنشاہیت کا تاج پہننا پڑا۔ انگریز فوج نے جو اس وقت شملہ کے پہاڑوں پر ہوا خوری کے لیے گئی ہوئی تھی، دہلی کے لیے کوچ کیا۔ اسی اثنا میں بغاوت دوسرے شہروں میں بھی پھیل گئی۔ دہلی سے دو سو پچاس میل دور ۳۰ مئی کو شاہ جہاں پور میں بڑی پریشانی کا عالم تھا۔

چھاؤنی میں ریڈ مین ایک اینگلو انڈین گھرانہ تھا۔ اس کے مکان کو رات کے وقت آگ لگا دی گئی۔ ریڈ مین اپنے بال بچوں سمیت بچ گیا مگر اس کا سارا سامان لوٹ لیا گیا یا توڑ پھوڑ دیا گیا۔ اسی رات کو ایک جانی پہچانی صورت وہاں دکھائی دی۔ جاوید خان ایک روہیلا پٹھان جس کو شہر کا ہر آدمی جانتا تھا، اسے آگ زنی کے جرم کے شبہ میں قید

کر کے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔

شاہ جہاں پور کے بازاروں میں جاوید خان کا خوب دبدبہ تھا۔ اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کوئی بھی خطرناک اور جوکھم بھرا کام کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ شرط یہ تھی کہ اس کو اس کا مناسب معاوضہ مل جائے۔ حکومت نے اسے کئی وارداتوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے حراست میں لے لیا تھا۔ لیکن جاوید انگریزی قانون سے واقف تھا۔ اس نے مجسٹریٹ سے گواہ پیش کرنے کے لیے کہا۔ کوئی بھی شخص اس بات کی گواہی دینے کے لیے آگے نہیں بڑھا جس نے جاوید خان کو جلتے ہوئے بنگلے سے بھاگتے ہوئے دیکھا ہو۔ مقدمہ مزید گواہ پیش کرنے کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ جاوید جب کچہری کے کمرے سے باہر نکلا تو یہ کہنا مشکل تھا کہ سپاہی اس کی رہنمائی کر رہے تھے یا وہ سپاہیوں کی۔ کمرے سے باہر آنے سے پہلے اس نے ایک حقارت آمیز نگاہ مجسٹریٹ مسٹر رِکٹ پر ڈالی اور کہا۔ ''میں اپنے گواہ کل پیش کروں گا۔ میں نہیں جانتا تم ان کو سنو گے یا نہیں۔''

ریڈ مین کے بنگلے کو جلائے جانے کی واردات نے شاہ جہاں پور میں مختصر سی انگریزی آبادی پر کسی خطرے کا اثر نہیں ڈالا تھا۔ میرٹھ دور تھا اور مقامی اخبار 'مسلایٹ' میں ہنگامے کے تعلق سے زیادہ خبریں نہیں تھیں۔ فوجی افسران کسی غیر متوقع بات کے ہونے سے بے خبر اپنی گشت پر تھے اور لوگ اپنے کاموں پر جا رہے تھے۔ رات کو وہ حسب معمول کھانے، پینے اور ڈانس کے لیے جمع ہوئے۔

۳۰ مئی کو مہمان نوازی کی باری ڈاکٹر باولنگ کی تھی۔ اس کے ڈرائنگ روم میں نوجوان لیفٹیننٹ اسکاٹ نے گٹار پر ایک دھن چھیڑی اور مسز باولنگ نے ایک عاشقانہ گیت گایا۔ چار فوجی افسر کوٹ پیس کھیلنے میں منہمک تھے۔ جب کہ مسز رکٹ، مسز جینکنز، کلکٹر اور کپتان جیمز 'ایکشما' وہسکی کے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے موسم کے بارے میں بات کر رہے تھے۔

فقط لباڈور اور اس کے گھر والوں کو گڑبڑ ہونے کا امکان تھا اس لیے وہ پارٹی (دعوت) میں شامل نہیں ہوئے۔

لباڈور کی عمر ۴۲ برس کی تھی اور اس کی بیوی ۳۸ ویں سال میں تھی۔ ان کی لڑکی روتھ بڑی خوبصورت تھی۔ اس کے بال سیاہ اور آنکھیں چمکدار تھیں۔ ابھی پندرہ دن پہلے فتح گڑھ میں مسز شیلڈ کے اسکول سے اُسے اس کی ماں نے اس خیال سے کہ گھر پر وہ محفوظ رہے گی بلوالیا تھا۔

لباڈو کا باپ ایک فرانسیسی جانباز تھا اور مراٹھا فوج میں رہ چکا تھا۔ اس کی ماں رام پور کے مشہور خاندان سے تھی۔ اس کا نام مریم تھا۔ وہ اور اس کے بھائی عیسائی تربیت میں پلے بڑھے تھے۔ مریم جب اٹھارہ برس کی ہوئی تو اس کی شادی لباڈور سے ہوگئی۔ لباڈور ایک چپ چاپ رہنے والا سادہ لوح آدمی تھا اور مجسٹریٹ کے دفتر میں کلرک تھا۔ وہ جرسی (چینل جزیرے) کے ایک تاجر کا پوتا تھا۔ اس لیے اس کا پورا نام جرسی لباڈور تھا۔

جب کہ چھاؤنی کی بیشتر انگریز عورتیں نوکروں سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتی تھیں، مریم لباڈور ملنسار ہونے کے ناطے ان لوگوں سے بات چیت کر کے لطف اُٹھاتی تھیں۔ وہ لوگ اکثر دلچسپ شرمناک کہانیاں جن سے وہ بخوبی واقف تھے، سنا سنا کر اس کا دل بہلایا کرتے تھے اور مریم کو اس طرح جو کچھ اس نے سنا تھا یقین ہو چلا تھا کہ کچھ ہی دنوں میں شہر میں ہنگامی حالات پیدا ہو جائیں گے۔ میرٹھ میں ہوئے حادثات کی خبریں بازار میں اور سپاہیوں میں عام تھیں اور ایک فقیر، جو دریائے کھناٹ کے پاس رہتا تھا، نے یہ پیشین گوئی بھی کی تھی کہ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا جلد ہی ہندوستان سے خاتمہ ہو جائے گا۔ مریم نے اپنے خاوند اور لڑکی کو اس شام باولنگ کے یہاں دعوت میں جانے سے روک دیا تھا۔ مریم کی بیٹی بلا ناغہ گرجا جایا کرتی تھی۔ یہ ایک حیران کر دینے والی التجا تھی، یہاں تک کہ اگلے روز اتوار کو چرچ نہ جانے کا بھی مشورہ دیا گیا تھا۔

روتھ کو من مانی کرنے کی عادت تھی۔ وہ گرجا جانے کے لیے بضد تھی۔ اس کا باپ بھی راضی ہو گیا تھا۔

آفتاب صاف و شفاف چمکدار آسمان میں اُگ آیا تھا اور خوش قسمت تھے وہ لوگ جو پو پھٹتے ہی اُٹھ گئے تھے اور دریا کی طرف سے آرہی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہو رہے

تھے۔سات بجے گرجا گھر کا گھنٹہ بج اُٹھا۔لوگ چھاؤنی میں بنے اس چھوٹے سے مضبوط گرجا کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ لباڈور اور اس کی بیٹی کی طرح اتوار کی پوشاک میں پیدل چل رہے تھے تو کچھ بگھیوں پر سوار تھے یا پالکیوں میں تھے جنھیں پسینے سے تر کہار کندھوں پر اُٹھائے ہوئے دوڑ رہے تھے۔

سینٹ میری کا یہ چھوٹا سا گرجا گھر شاہ جہاں پور کی چھاؤنی کے جنوبی کنارے پر آموں کے ایک پرانے باغ کے نزدیک تھا۔ وہاں پہنچنے کے لیے تین راستے تھے۔ایک جنوب میں مینار کے نیچے سے جب کہ توشہ خانہ کا دروازہ شمال کی جانب تھا۔ایک تنگ زینے سے مینار پر بھی جایا جاسکتا تھا۔مشرق کی جانب دریا کے ساتھ ساتھ کھیتوں میں خربوزے کی کاشت ہوئی تھی۔مغرب کی طرف شہر کی حد بندی کے ساتھ ساتھ کھلا میدان تھا۔شمال میں پریڈ کا میدان تھا جو سپاہیوں کی بارکوں تک پھیلا ہوا تھا۔ پریڈ کے میدان کی طرف رجمنٹ کے انگریز افسروں کے بنگلے تھے۔ یہ لوگ کسی بھی شورش سے بے خبر گہری نیند سو رہے تھے۔

آگے کی کہانی روتھ کی زبانی۔

گرجا گھر میں

پاپا اور میں جب گھر سے باہر نکلے تو ہم نے کئی سپاہیوں کو سڑک پار کر کے دریا میں نہانے کے لیے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ ہماری طرف اس قدر غضبناک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کہ میں پاپا کے ساتھ چپک گئی اور آہستہ سے کہا ''دیکھو پاپا یہ لوگ کیسے دیکھ رہے ہیں!'' غالباً پاپا کو ان کے چہروں پر کوئی ایسی بات دکھائی نہیں دی۔ سپاہی اکثر دریافت کھناٹ کی طرف جاتے ہوئے اسی راستے سے گزرتے تھے اور میرا خیال ہے دفتر جاتے ہوئے پاپا کی ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔

ہم جنوبی چھتے کی طرف سے گرجا میں داخل ہوئے اور بائیں طرف کی آخری نشست پر بیٹھ گئے۔ بہت سے لوگ پہلے ہی گرجا میں پہنچ چکے تھے۔لیکن میں نے کوئی

خاص دھیان نہیں دیا کہ وہ کون لوگ تھے۔ ہم اعتراف (Confession) کے دوران ابھی جھکے ہی تھے کہ باہر سے ہنگامے اور چیخ و پکار کا شور ہمارے کانوں میں پڑا جو قریب تر ہوتا گیا۔ چرچ میں حاضر سبھی لوگ کھڑے ہو گئے۔ پاپا اپنی سیٹ سے اُٹھ کر دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ میں بھی ان کے پاس آ گئی۔

چھتے پر چھ سات آدمی تھے جن کے چہرے ناک ڈھکے ہوئے تھے جیسے وہ اکھاڑے میں کشتی کرنے جا رہے تھے۔ان کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہیں وہ لوگ ہماری طرف لپکے اور ایک نے ہم پر وار کیا جو خالی گیا اور تلوار دروازے میں دھنس گئی۔ پاپا بائیں ہاتھ سے دروازے کو پکڑے ہوئے تھے اور میں اس کے نیچے سے نکل کر گرجا کے صحن میں آ گئی۔ پاپا پر دوسرا اور تیسرا وار ہوا جس نے ان کے داہنے گال پر زخم کر دیا۔ پاپا نے ایک حملہ آور کے ہاتھ سے تلوار چھیننے کی کوشش کی۔لیکن ان کا ہاتھ سیدھا تلوار کی دھار پر پڑا۔ وہ بھی زور سے کہ ان کے داہنے ہاتھ کی دو انگلیاں کٹ کر الگ ہو گئیں۔ وہ بس اتنے ہی زخمی ہوئے تھے۔اگرچہ وہ گرے نہیں تھے لیکن خوب بے تحاشہ ان کے ہاتھ سے بہہ رہا تھا۔اس وقت تک میں چھتے پر سے دیکھ رہی تھی اور حیران و پریشان تھی کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے پاپا سے پوچھا تھا کہ اتنا خون کیوں نکل رہا ہے۔

''میری جیب سے رومال نکال کر میرے چہرے پر پٹی باندھ دو۔'' انھوں نے کہا۔ میں نے پاپا کے اور اپنے رومالوں کی ایک پٹی بنائی اور ان کے سر کے گرد باندھ دی۔ پاپا نے کہا وہ گھر جانا چاہتے ہیں۔ میں ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کو چھتے سے باہر لے جانے کی کوشش میں تھی کہ چند ہی قدم چلنے پر بے ہوشی کے سے عالم میں بولے ''روتھ بیٹی میں نہیں چل سکتا۔آؤ ہم واپس گرجا گھر میں ہی چلتے ہیں۔''

ہتھیار بند بلوائیوں نے گرجا گھر پر صرف ایک ہی حملہ کیا تھا اور توشہ خانہ کی طرف سے باہر نکل گئے تھے۔ پاپا کو زخمی کرنے کے بعد وہ گرجا کے درمیانی راستے سے دائیں بائیں دونوں طرف تلواریں چلا رہے تھے۔ایک حملہ لیفٹیننٹ اسکاٹ پر بھی ہوا لیکن اس

کی ماں اس کے اوپر گر گئی اور تلوار اس کی پسلیوں میں گھس گئی۔ اس کی تنگ پوشاک نے اسے بری طرح زخمی ہونے سے بچالیا۔ مسٹر رِکٹ، مسٹر جیکنز، کلکٹر اور مسٹر میک کلم توشہ خانے کے راستے سے بھاگ نکلے۔

باقی سب لوگ گھنٹہ گھر پر چڑھ گئے اور پاپا کے کہنے پر میں بھی اُن کے ساتھ ہولی۔ ہم نے کپتان جیمز کو گرجا گھر کی طرف گھوڑے پر آتے ہوئے دیکھا۔ شاید اسے خبر نہیں تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ہم اسے آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے چلائے اور جیسے ہی اس نے آنکھ اُٹھا کر ہماری طرف دیکھا پریڈ گراؤنڈ میں اکٹھے سپاہیوں میں سے ایک نے اسے گولی کا نشانہ بنایا اور وہ گھوڑے سے نیچے گر گیا۔ دو اور افسر میس کی طرف سے دوڑتے ہوئے آ رہے تھے اور سپاہیوں سے کہہ رہے تھے۔ ''ارے بچو! یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' وہ سپاہیوں کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن کسی نے ان کی ایک نہ سنی۔ سپاہیوں میں ان کا اچھا خاصا رسوخ تھا اور اسی لیے ان کو ہاتھوں میں پستول لیے برج پر ہمارے پاس آنے سے کسی نے نہیں روکا۔

اسی وقت ہم نے ایک بگھی کو تیزی سے گرجا گھر کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ یہ بگھی ڈاکٹر باولنگ کی تھی اور اس میں وہ خود، ان کی بیوی اور بچہ اور اس کی آیا سوار تھے۔ بگھی پریڈ گراؤنڈ سے باہر آ رہی تھی اور جیسے ہی آدھے راستے میں پہنچی کہ ایک گولی ڈاکٹر باولنگ کے لگی۔ وہ بگھی کے آگے بیٹھا ہوا تھا۔ گولی لگتے ہی وہ اپنی سیٹ پر دوہرا ہو گیا لیکن لگام میں ہاتھ سے نہیں چھوڑیں۔ بگھی لگ بھگ گرجا گھر کے پاس پہنچ گئی تھی۔ ایک سپاہی نے بڑھ کر مسز باولنگ پر وار کیا جو خالی گیا اور وہ بال بال بچ گئی۔ بگھی جیسے ہی گرجا گھر پہنچی کچھ افسران بھاگ کر ڈاکٹر باولنگ کو بگھی سے اتارنے کے لیے گئے۔ وہ زندگی کے لیے ان کے بانہوں میں جوجھ رہا تھا اور آخر جب اسے زمین پر اتارا گیا تو وہ دم توڑ چکا تھا۔

میں بھی ان افسران کے ساتھ برج سے نیچے آ گئی اور اپنے پاپا کو دیکھنے کے لیے بھاگی۔ وہ دیوار کے سہارے سے خون میں لت پت بیٹھے تھے۔ انھوں نے کسی قسم کے

درد کی کوئی شکایت نہیں کی۔ ان کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے اور وہ بمشکل اپنی آنکھیں کھول سکتے تھے۔ انھوں نے مجھے گھر جا کر ماں سے کہہ کر ایک چارپائی یا پالکی کے ساتھ کسی کو بھیجنے کے لیے کہا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی جلدی ہو گیا تھا کہ میں بدحواس ہو گئی تھی۔ مسز باولنگ اور دوسری عورتیں رو رہی تھیں۔ لیکن میری آنکھوں میں آنسو کا قطرہ تک نہیں تھا۔ پاپا کے چہرے پر دو گہرے زخم تھے۔ میں ان کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ لیکن ان کی جان بچانے کے لیے اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا کہ میں بھاگ کر گھر جاؤں اور ایک پالکی کا بندوبست کر کے لے آؤں۔

میں پاپا کو گرجا گھر کی پتھر کی دیوار کے سہارے چھوڑ کر بھاگتی ہوئی توشہ خانے کی طرف آئی اور مسٹر رِکٹ کی لاش کے اوپر گرتے گرتے بچی، جو توشہ خانہ کی دروازے سے تقریباً بارہ فٹ کی دوری پر پڑی تھی۔ کسی ماہر اور مضبوط تلوار باز نے اس کے بائیں کندھے پر اس طرح سے حملہ کیا تھا کہ اس کا سر اور دایاں بازو دھڑ سے الگ ہو گئے تھے۔ اس نظارے کو دیکھ کر میں خوف زدہ ہو گئی اور بلر لوگوں کے احاطے سے بھاگتی ہوئی گھر کی طرف دوڑی ہوئی چلی گئی۔

راستے میں مجھے کوئی نہیں ملا۔ کسی نے مجھے نہ تو للکارا، نہ ہی میرا راستہ روکا اور نہ ہی میرے ساتھ کسی طرح کی بدتمیزی کی گئی۔ چھاؤنی خالی اور اجاڑ سی دکھائی دے رہی تھی۔ مگر جیسے ہی میں بُلر لوگوں کے احاطے کے آخری کنارے پر پہنچی مجھے اپنے گھر سے آگ کی لپٹیں اُٹھتی دکھائی دیں۔ میں پھاٹک پر رکی۔ میں اپنی ماں کو ادھر ادھر دیکھ رہی تھی لیکن وہ کہیں نہیں تھیں۔ دادی بھی وہاں نہیں تھی اور نہ ہی کوئی نوکر چاکر۔ پھر میں نے لالہ رام جی لال کو سڑک پر اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔

''گھبراؤ مت میری بچی'' وہ بولا ''تمھاری ماں، دادی اور باقی سبھی لوگ محفوظ ہیں۔ آؤ میں تمھیں ان کے پاس لے چلتا ہوں۔''

لالہ رام جی لال کی نیت پر کسی قسم کا شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں جب بچی تھی تو وہ مجھے گھٹنوں پر جھلایا کرتے تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ہی میں اتنی بڑی ہوئی تھی۔ وہ

ہمارے پرانے گھر سے لگ بھگ تیس گز کے فاصلے پر ایک جھونپڑے میں لے گیا۔ یہ ایک کچا مکان تھا جو سڑک کے کنارے پر تھا۔ اس کا دروازہ بند تھا۔ لالہ نے دروازے پر دستک دی۔ لیکن اندر سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر اس نے دروازے کی دراڑ میں سے آہستہ سے کہا ''مس بابا میرے ساتھ ہے۔ دروازہ کھولیے۔''

دروازہ کھلتے ہی میں اپنی ماں کی بانہوں سے لپٹ گئی۔

''شکر ہے خدا کا'' ماں چلائی ''آخر ایک کی تو جان بچ گئی۔''

''پاپا گر جا گھر میں زخمی پڑے ہیں۔'' میں نے کہا ''کسی کو بھیجو ان کو لے آئے۔''

ماں نے لالا کی طرف نظر بھر کر دیکھا اور وہ ماں کی آنکھوں کی التجا کو سمجھ گئے۔

''میں جاتا ہوں۔'' لالا نے کہا ''جب تک میں نہ آؤں یہاں سے مت ہلیے گا۔''

''تمھیں نہیں معلوم پاپا کہاں ہیں۔'' میں نے کہا ''میں بھی تمھارے ساتھ چلتی ہوں۔''

''نہیں۔ تم اپنی ماں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گی۔'' لالا نے کہا ''تم میرے ساتھ رہو گی تو ہم دونوں ہی مارے جائیں گے۔''

رام جی لال بہت دیر کے بعد دوپہر کو لوٹا۔ ''صاحب فوت ہو چکے ہیں۔'' اس نے بڑی سادگی سے کہا۔ ''جس وقت وہ دم توڑ رہے تھے میں اسی وقت پہنچا۔ خون اتنا بہہ چکا تھا کہ ان کا بچنا مشکل تھا۔ ان سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ان کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ لیکن انھوں نے میری طرف اس طرح سے دیکھا جیسے وہ مجھے پہچان رہے ہوں.....''

لالا رام جی لال

لالا دوپہر کے وقت چلا گیا یہ وعدہ کر کے کہ وہ اندھیرا ہونے پر لوٹ آئے گا اور ہمیں اپنے گھر لے جائے گا۔ ایسا کرنے پر وہ ایک بہت بڑا خطرہ مول لے رہا تھا۔ اس نے ہماری حفاظت کی ذمہ داری لی تھی۔ وہ ایک ایسا آدمی تھا کہ ایک بات کو اگر ٹھان لیتا تو اسے پورا کر کے ہی رہتا۔ وہ کوئی سرکاری ملازم نہیں تھا اور نہ انگریزوں کے تئیں

وفاداری رکھتا تھا۔ باغیوں کے ساتھ بھی اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا، کیوں کہ دونوں کے راستے الگ تھے۔ وہ اپنے دھندے سے کافی مطمئن تھا (اس کے پاس کئی پالکیاں اور گھوڑا گاڑیاں تھیں جو وہ انگریزوں کو کرائے پر دیتا تھا (کیوں کہ وہ انھیں خرید نہیں سکتے تھے۔) جن لوگوں سے اس کا واسطہ پڑتا تھا وہ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ ہر کام میں اس کا اپنا ذاتی مفاد ہوتا تھا۔ وہ ہماری مدد اس لیے نہیں کر رہا تھا کہ ہم حکمراں جماعت میں سے تھے۔ میرے والد شاہ جہاں پور میں سب سے کم رتبے کے افسر تھے۔ لالا ہمیں بہت برسوں سے جانتا تھا اور میری ماں سے تو اس کا بہت لگاؤ تھا کیوں کہ وہ ہمیشہ اسے اپنا دوست اور برابر کا تصور کرتی تھیں۔

مجھے اب احساس ہو گیا تھا کہ میں بنا باپ کے ہوں اور میری ماں بیوہ ہو گئی تھیں۔ لیکن وہ وقت ہمارے ذاتی غم کے اظہار کرنے کا نہیں تھا۔ ہماری زندگی ہر طرف سے خطرے میں تھی۔ ہمارے اس چھپنے کی جگہ تک ہمارے اپنے جلتے ہوئے گھر سے لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز آ رہی تھی۔ شہر سے چھاؤنی تک جانے والی سڑک پر ہنگامہ برپا تھا اور ہر طرف لوگوں کا شور شرابہ تھا۔ ہمارے دروازے کے سامنے سے بھاری قدموں سے آتے جاتے لوگوں کی آواز ہمارے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ فقط اِک آہ کی آواز یا چھینک ہمیں مصیبت میں ڈال سکتی تھی اور ہمیں بازار کے بدمعاشوں کے رحم و کرم پر چھوڑ سکتی تھی جو ہاتھوں میں ننگی تلواریں چمکاتے گھوم رہے تھے۔

اس چھوٹے سے کمرے میں ہم آٹھ افراد تھے۔ امی، دادی، میں، میری چچازاد بہن آنیٹ، میری امی کا سوتیلا بھائی پلو جو میری ہی عمر کا تھا اور اس کی ماں، ہماری نوکرانیاں چمپا اور لاڈو۔ ان کے علاوہ ہمارے سفید اور کالے دو کتے جو امی کے پیچھے چلے آئے جیسے ہی وہ گھر سے نکلیں۔

مٹی کا یہ کچا گھر جس میں ہم پناہ گزیں ہوئے تھے ترلوکی کا تھا جو ایک راج مستری تھا اور جس نے ہمارے گھر کے بننے میں مدد کی تھی۔ ہم اسے بڑی اچھی طرح سے جانتے تھے۔ بغاوت سے کچھ ہفتے پہلے جب امی نوکروں سے شاہ جہاں پور میں ہنگامہ برپا

ہونے کے امکانات پر بات چیت کر رہی تھیں تو ترلوکی ان لوگوں میں سے ایک تھا جس نے ضرورت پڑنے پر ہمیں اپنے مکان میں پناہ دینے کی پیش کش کی تھی۔ امی نے اس کی یہ پیش کش احتیاط کے طور پر منظور کر لی تھی اور اس سے اس کے گھر کی چابی بھی لے لی تھی۔

امی نے بعد میں مجھے بتایا کہ اُس روز صبح وہ برآمدے میں بیٹھی تھیں تو مالی کا لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور بولا: ''غدر شروع ہو گیا ہے۔ صاحب اور مسی بابا قتل کر دیے گئے ہیں۔'' یہ خبر سنتے ہی کہ ہم دونوں مارے گئے ہیں امی کے دل میں جو پہلی بات آئی وہ نزدیک کے کسی کنوئیں میں چھلانگ لگانے کی تھی۔ لیکن دادی نے اسے پکڑ کر اس قسم کی جلد بازی کرنے سے یہ کہہ کر روکا ''تم ایسا کرو گی تو ہم لوگوں کا کیا ہوگا؟'' اس طرح سے وہ سڑک پار کر کے دوسرے افراد کے ساتھ ترلوکی کے گھر میں آ گئیں اور اندر آ کر دروازے کو کنڈی لگا دی۔

سارا دن ہم اس جھونپڑی میں بند رہے۔ خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا کہ جلدی ہی ہمیں کوئی ڈھونڈ نکالے گا اور ہمارا خاتمہ کر دے گا۔ پاپا کے قتل کے بعد ہمارا مستقبل اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ ہمارے لیے بات کرنا بھی مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ گرم لُو کے تھپیڑے دروازے کی دراڑوں میں سے اندر آ رہے تھے۔ ہمارے گلے پیاس سے سوکھ گئے تھے۔ بعد دوپہر جھونپڑی کے پیچھے کھڑکی کے پاس پیڑ پر سے کسی نے ٹھنڈے پانی کی بالٹی لٹکائی۔ یہ مہربانی ہم پر ترس کھا کر چنٹا نے کی تھی جو ہمارا مکان بنتے وقت وہاں مزدوری کیا کرتا تھا۔

دس بجے کے قریب لالا، دھنی اور ہمارے ایک پرانے خدمت گار کے ہمراہ آیا۔ اس نے ہمیں اپنے گھر پر لے جانے کی پیش کش کی۔ امی پہلے تو باہر آنے سے ہچکچائیں۔ لالا نے یقین دلایا کہ سڑکیں بالکل صاف ہیں اور ان کے ساتھ کسی طرح کی بدتمیزی کیے جانے کا امکان نہیں ہے تو امی آخر مان گئیں۔

ہم دو حصوں میں بٹ گئے۔ لالا کے ایک ہاتھ میں ننگی تلوار تھی اور دوسرے میں

چھاتا۔ وہ آگے چل رہا تھا۔ امی، آنیٹ اور میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اس کے پیچھے تھے۔ امی نے ہمارے اوپر پلنگ پوش ڈال دیا جو وہ گھر سے نکلتے وقت اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ ہم بڑی سڑک کو چھوڑ کر بھنگیوں کے گھروں کے باہر سے ہوتے ہوئے پندرہ منٹ میں لالا کے گھر پہنچ گئے۔ گھر پہنچ کر لالا نے ہمیں ایک چارپائی پر بٹھا دیا اور خود زمین پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔

ترلوکی کے گھر سے نکلتے وقت امی نے اپنا چابیوں کا گچھا پھینک دیا تھا۔ میں نے امی سے ایسا کرنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے میرا دھیان آگ میں جل رہے بنگلے کی طرف دلایا اور کہا ''اب وہ چابیاں بھلا ہمارے کس کام کی تھیں۔''

خدمت گار دھنی رام بھی دوسرے جتھے کے ساتھ جس میں میری دادی، پلّو اور اس کی ماں، چمپا اور لاڈو اور کتے تھے پہنچ گیا۔ لالا کے اس چھوٹے گھر میں ہم کل آٹھ افراد تھے اور جہاں تک مجھے یاد ہے اس کا اپنا گھرانہ بھی اتنا ہی بڑا تھا جتنا ہمارا۔

ہمارے سامنے کھانا پروسا گیا لیکن ہم سے کھایا نہ گیا۔ رات کو ہم آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ امی، دادی اور میں ایک بستر پر اور باقی لوگ زمین پر۔ اندھیرے میں، میں نے اپنا چہرہ ماں کے سینے کے ساتھ چپکا لیا تھا اور رو کر اپنا غم کا غبار نکال رہی تھی۔ امی بھی آہستہ آہستہ رو رہی تھیں اور مجھے نیند آنے تک وہ روتی ہی رہیں۔

لالا کا گھر

لالا رام جی لال کے گھر میں اس کے علاوہ، اس کی بیوی، ماں، چاچی اور بہن تھے۔ یہ گھر عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ لالا کہ طاقت اور صبر کا ایک طرح سے امتحان تھا کہ وہ بارہ بے صبر عورتوں کے بیچ رہ رہا تھا۔

لالا کے گھر والے ہم سے بخوبی واقف تھے کیوں کہ لالا کی ماں اور چاچی اکثر ہمارے گھر، حوض سے پانی لینے آتی رہتی تھیں اور ہمارے گھر کے پاس ایک سمادھی پر بیل کے پتے چڑھانے بھی آتی تھیں۔ پہلے پہل تو وہ ہم سے شرما گئیں اور ہم اپنے غم میں اس

قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ مکان کے ایک کونے میں چھپ کر بیٹھ جاتے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رونے لگتے۔ لالا کی بیوی پتوں میں کھانا پروس کر ہمارے سامنے رکھتی تھی۔ چوبیس گھنٹے میں ہم فقط ایک ہی بار کھاتے تھے، وہ بھی دوپہر کے بعد۔ لیکن تھوڑا کھانا کھا کر بھی ہمیں پوری طرح تسلی ہو جاتی تھی۔

مکان وہی گارے مٹی کا بنا ہوا تھا جس میں چار کمرے تھے اور ان کے سامنے ایک برآمدہ اور پیچھے ایک صحن تھا۔ مکان بالکل سادہ اور چھوٹا تھا جس میں قلیل آمدنی والے لوگ رہتے تھے۔

لالا کی بیوی ناٹے قد اور اچھے نقش ونگار والی جوان عورت تھی۔ ہمیں اس کا نام معلوم نہیں تھا کیوں کہ خاوند یا بیوی کو ایک دوسرے کا نام لے کر پکارنے کی روایت نہیں تھی۔ لیکن لالا کہ ماں اسے دلہن کہہ کر بلاتی تھی۔

لالا خود لمبا، دبلا پتلا، بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی تھا۔ دوسرے کاپستھون کی طرح اُس کی گفتگو میں بڑی شائستگی تھی۔ لیکن دوسروں کے مقابلے میں وہ ارادے کا پکا تھا۔

ہمارے آنے کے دوسرے دن میں نے اس کی ماں کو کہتے ہوئے سنا ''لالا تم نے ان انگریز خواتین کو گھر میں لا کر بڑی بھاری بھول کی ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟ باغیوں کو جیسے ہی ان کی خبر ملے گی وہ آ کر ہم سب کو ختم کر دیں گے۔''

''میں نے جو کچھ بھی کیا ہے ٹھیک ہی کیا ہے۔'' لالا نے بڑی حلیمی سے کہا۔ ''میں نے ان انگریز خواتین کو پناہ دی ہے۔ میں نے اپنے دوستوں کو پناہ دی ہے۔ لوگوں کو جو کہنا ہے کہتے رہیں۔''

وہ گھر سے کہیں باہر نہیں جاتا تھا۔ ہر وقت گھر کے اگلے دروازے پر پڑا رہتا یا اپنا چھوٹا حقہ پیتا یا پھر کوئی دوست یار آ جاتا تو اس کے ساتھ چوسر کھیلتا۔ کچھ دنوں کے بعد لوگوں کو شک ہو گیا کہ لالا کے گھر میں کوئی ہے جس کی وجہ سے لالا بہت محتاط رہتا ہے لیکن کسی کو یہ اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ یہ مہمان کون تھے۔ لالا کی چاچی نے امی کو بتایا کہ ہمارا تیسرا کتا جو ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا، ہمارے دھواں اگلتے بنگلے کے کھنڈروں کے اردگرد

گھومتا ہوا دیکھا گیا تھا اور بغاوت کے دوسرے دن وہ اپنے مالک کے لوٹنے کے انتظار میں بیٹھا بیٹھا مر گیا تھا۔

ایک دن لالا جب آیا تو ہم فرش پر بیٹھے موجودہ حالات کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ آنے والے کل کی فکر نے ہمارے موجودہ غم کو بھلا دیا تھا۔ ہم نے بغیر روئے دھوئے سارا واقعہ بیان کر دیا۔

لالا ہاتھ میں کھلی ہوئی تلوار لیے زمین پر بیٹھ گیا۔ یہ تلوار اس کے لیے ایک لازمی ہتھیار بن گیا تھا۔ لیکن میرے خیال میں ابھی تک اسے اس ہتھیار کو استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ یہ تلوار اس کی اپنی نہیں تھی اور اس کو لوٹ مار کے بعد کچہری میں فرش پر پڑی ملی تھی۔

''لالہ کیا ہم تمھارے گھر میں محفوظ ہیں؟'' امی نے پوچھا۔ ''آج کل باہر کی کیا خبر ہے؟''

''یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔'' لالا نے تلوار گھماتے ہوئے کہا ''اس گھر میں کسی کے آنے کی ہمت نہیں۔ جب تک میں زندہ ہوں کوئی آئے گا تو میری لاش پر ہو کر آئے گا۔ اس میں جھوٹ نہیں کہ میں نے کافروں کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ کئی لوگ مجھ سے پوچھ چکے ہیں کہ میں اپنے گھر پر کڑی نظر کیوں رکھے ہوئے ہوں۔ میرا جواب ہوتا ہے کہ چوں کہ بغاوت نے میرا دھندہ چوپٹ کر دیا ہے اس لیے میرے پاس گھر بیٹھے اپنی عورتوں کی حفاظت کرنے کے سوا اور کام ہی کیا ہے۔ وہ پھر پوچھتے ہیں کہ میں دوسرے لوگوں کی طرح نواب کے پاس کیوں نہیں گیا۔''

''کون سا نواب۔ لالا؟'' امی نے پوچھا۔

''سپاہیوں کے شہر میں داخل ہونے کے بعد اُن کے سردار صوبے دار میجر نے قادر علی خان کو نواب کی گدی پر بٹھا دیا اور سارے شہر میں اس کی ڈونڈی پٹوا دی۔ نظام علی کو جو کہ پنشن خوار تھا کوتوال بنا دیا گیا۔ کچھ اور ذمے دار عہدے جاوید خان اور نظام علی خاں کو بھی دیے گئے لیکن نظام علی خان نے ان عہدوں کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا۔''

''اور جاوید خان.....؟''

''اس نے بھی ابھی کوئی عہدہ نہیں سنبھالا کیوں کہ وہ ازو خان کے ساتھ مل کر صاحب لوگوں کے مکانوں کی لوٹ مار میں لگا ہوا تھا۔ جاوید نے ہی خزانچی پر حملے کے لیے اکسایا تھا۔ وہ اس طرح سے ہوا.....

''آپ جانتی ہیں کہ جاوید شہر کا ایک بڑا غنڈا ہے۔ نئے نواب کو گدی پر بٹھانے کے بعد سپاہی جب اپنی بارکوں میں لوٹے تو جاوید ان کے کمانڈر سے ملا۔ اسے جب اس بات کا علم ہوا کہ رجمنٹ شاہ جہاں پور چھوڑ کر بریلی برگیڈ میں شامل ہونے جا رہی ہے تو اس نے صوبہ دار میجر گھنشام سنگھ کو جانے سے پہلے روز آرم فیکٹری پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا۔ صوبہ دار نے زور آور سنگھ کی قیادت میں ایک مہم جاوید کے ہمراہ کی اور وہ اس سڑک پر آ گئے جو جھنّہ لال خزانچی کے گھر کے پاس سے گزرتی ہے۔ وہاں رُک کر انھوں نے جھنّہ لال سے کچھ رقم طلب کی۔ جھنّہ لال کو اسی صبح جلال آباد کے تحصیل دار سے چھ ہزار روپے وصول ہوئے تھے۔ صوبہ دار نے فوراً ہی یہ روپے اس سے چھین لیے۔ جھنّہ لال نے مزید رقم دینے سے جب انکار کر دیا تو اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے درخت سے لٹکا دیا گیا۔ اسی وقت جاوید خان نے اس کے سبھی بہی کھاتے اُٹھا کر کنویں میں پھینک دیے اور کہا ''تم نے چوں کہ ہمیں روپیہ دینے سے انکار کیا ہے تو یہ رہے تمھارے حساب کے بہی کھاتے۔ اب تم اوروں سے اپنا روپیہ وصول نہیں کر پاؤ گے۔''

اُن کے جانے کے بعد جھنّہ لال کے نوکر نے اُسے درخت سے نیچے اتارا۔ خوف کے مارے وہ نیم مردہ ہو گیا تھا اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ لیکن جونہی اسے ہوش آیا اس نے اپنے نوکروں سے کنویں میں اتر کر تمام کتابیں نکال لانے کے لیے کہا۔

''آرم فیکٹری کا کیا انجام ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''جاوید خان کے آدمیوں نے اس میں آگ لگا دی۔ کم سے کم ستر ہزار گیلن رم کے اور بڑی تعداد میں گڑ کے ڈھیلے برباد ہو گئے۔ باقی جو بچا لوگوں نے لوٹ لیا۔ جاوید خان کے حصے میں بھی گڑ کی بھیلیوں کا بھرا ہوا ایک تھیلا آیا۔''

اگلے روز جب لالا ہمارے پاس آ کر بیٹھا، وہ اکثر ہر روز ہمارے پاس ایک گھنٹہ گزارا کرتا تھا، میں نے اس سے ایک سوال پوچھا جو مجھے ایک عرصے سے پریشان کر رہا تھا اور میں اس کا جواب سننے سے خوف زدہ بھی تھی۔ ''میرے پاپا کی لاش کا کیا ہوا؟''

''میں نے تمھیں پہلے ہی بتا دیا ہوتا مسی بابا لیکن میں تمھیں پریشان کرنے سے ڈر رہا تھا۔ جس دن میں آپ لوگوں کو اپنے گھر لے کر آیا تھا تب میں دوبارہ گرجا گھر گیا تھا۔ وہاں میں نے تمھارے پاپا، کلکٹر صاحب، ڈاکٹر کی لاشوں کو پڑا ہوا پایا تھا۔ بالکل اسی جگہ جہاں میں پہلے چھوڑ کر آیا تھا۔ اتنی گرمی اور لُو کے باوجود بھی لاشوں کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ ناہی گدھوں یا بھیڑیوں نے انھیں چھوا تھا۔ فقط ان کے جوتے غائب تھے۔

''جوں ہی میں وہاں سے مڑا دو مسلمان کپتان جیمز کی لاش کو اٹھا کر لا رہے تھے، جو گرجا گھر سے کچھ دوری پر گولی لگنے سے مرا ہوا پڑا تھا۔ اس لاش کو بھی انھوں تمھارے پاپا اور باولنگ کی لاشوں کے پاس رکھ دیا اور مجھ سے کہا کہ انھوں نے مارے گئے عیسائیوں کی لاشوں کو دفنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ ایسا کر کے وہ خطرہ مول لے رہے ہیں، کیوں کہ نواب کے آدمی ان پر فرنگیوں سے ہمدردی رکھنے کا الزام لگائیں گے۔ انھوں نے مانا کہ وہ ایسا کرنے سے خطرہ مول لے رہے ہیں لیکن ان کے ضمیر نے انھیں اس کام کا بیڑا اٹھانے کے لیے اُکسایا ہے اور وہ اس کا نتیجہ بھی بھگتنے کے لیے تیار ہیں۔

''مجھے ان کا ارادہ جان کر بڑی ندامت ہوئی۔ میں نے اپنا لمبا کوٹ اتار پھینکا اور لاشوں کو اٹھا کر اس گڈھے میں ڈالنے میں، جو انھوں نے گرجا گھر کے باہر کھودا تھا، میں ان کی مدد کرنے لگا۔ یہاں میں نے مسٹر میک فلام، پادری صاحب اور نائب کلکٹر مسٹر اسمتھ کی لاشوں کو بھی پہچان لیا۔ سبھی چھ لاشوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ دفنا دیا اور قبر کو ایک بڑے پتھر سے ڈھک کر اس پر متوازی لائنیں کھینچ دیں تا کہ چھ قبریں الگ الگ لگیں۔ یہ کام ایک گھنٹے میں ختم ہو گیا اور جب میں اس جگہ سے ہلا تو میرے دل کو تسلی ہوئی جس کا میں بیان نہیں کر سکتا.....''

رام جی لال کا بیان سن کر جو نزع ہم پر طاری ہوئی تھی اس سے ہوش میں آنے پر میں نے پھر اس سے پوچھا کہ مسٹر میک فلام پادری کی موت کس طرح واقع ہوئی کیوں کہ جب بدمعاش گرجا گھر میں گھس آئے تھے میں نے پادری کو ممبر سے نیچے اُتر کر مسٹر رِکٹ کی ماں کے ساتھ توشہ خانے سے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔

''اس بارے میں آپ کو تفصیل سے کچھ نہیں بتا سکتا'' لالا نے کہا ''میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب باغیوں نے مسٹر رِکٹ پر حملہ کیا تو مسٹر میک فلام خربوزے کے کھیتوں میں پہنچ گیا تھا اور بیلوں کے پیچھے چھپ گیا تھا لیکن ایک دوسرے گروہ نے اسے ڈھونڈ نکالا اور تلواروں سے اس کا قتل کر دیا۔

''بچارہ مسٹر میک فلام!'' امی نے آہ بھر کر کہا ''وہ بچارہ تو بڑا اچھا آدمی تھا جو کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا تھا اور آرتھر اسمتھ کے ساتھ کیا بیتی لالا؟'' امی ہر اس آدمی کے بارے میں جاننا چاہتی تھیں جن کو ہم جانتے تھے۔

''نائب صاحب کا قتل شہر میں ہوا تھا۔'' لالا نے کہا ''ہنگامے کے وقت وہ اپنے بنگلے پر بیمار پڑا تھا۔ اس نے چھاؤنی چھوڑ کر شہر میں جانا زیادہ محفوظ سمجھا اس خیال سے کہ بغاوت میں صرف سپاہی ہی شامل تھے۔ وہ کچہری میں گیا جو ایک قتل گاہ بن چکی تھی۔ جیسے ہی گلی میں مڑا کہ بھیڑ کے ایک ریلے نے اسے گھیر لیا اور دھکیلنے لگے۔ ایک آدمی اپنی تلوار کے ہتھے سے اسے کچوکے لگا رہا تھا۔ مسٹر اسمتھ کو غصہ آ گیا اور بخار ہونے کے باوجود بھی اس نے اپنی پستول ایک آدمی پر داغ دی مگر افسوس کہ پستول کا ڈھکن نہیں کھلا اور اس کا وار خالی گیا۔ اس نے ایک بار پھر نشانہ باندھا مگر گولی اس آدمی کی پیٹی کے کندے سے ٹکرا کر زمین پر آ گری۔ ناامید ہو کر مسٹر اسمتھ نے پستول پھینک دی۔ وہ آدمی اب مسٹر اسمتھ پر تلوار کے وار کر رہا تھا اور مسٹر اسمتھ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تھا۔ اب بھیڑ اس پر ٹوٹ پڑی۔ قسمت نے اسمتھ صاحب کا ساتھ نہیں دیا۔ کمپنی بہادر کی عزت مٹی میں مل گئی۔ کسی نے کبھی پستول کو بند ہوتے سنا تھا یا گولی کو پیٹی کے کندے سے لگ کر وار بیکار ہوتے دیکھا تھا؟''

نام کا بدلنا

رام جی لال کے ذریعے جو خبریں ہم تک پہنچ رہی تھیں، اُن سے تو ایسا لگتا تھا کہ جون کا آدھا مہینہ بیتنے تک شاہ جہاں پور میں مقیم ہر یورپی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اگر شہر میں نہیں تو دریائے کھنٹ کے اس پار محمدی میں جہاں مسز باولنگ اور اس کی بچی بھاگ کر چلے گئے تھے۔ بچنے والوں میں سے صرف ہم تھے اور (جیسا کہ ہمیں بعد میں پتا چلا) ریڈ مین کا گھرانہ اور ہم بھی اس لیے بچ گئے تھے کہ دنیا شاید یہی سمجھتی تھی کہ ہم ختم ہو چکے ہیں۔ یہ بات بھی ہم پر تب واضح ہوئی جب مچھلی بیچنے والی ایک عورت ہمارے دروازے پر آئی۔

لالا کی بیوی نے اس سے کہا: ''تم بہت دن بعد آ رہی ہو اور آج تو تم نے ابھی تک کچھ بیچا بھی نہیں۔''

''اولللائن!'' عورت نے کہا ''اب خریدار ہی نہیں۔ فرنگی تو چلے گئے۔ ایک وقت تھا جب میں لباڈور کے ہاں ہر روز جاتی تھی اور چار پانچ آنے کما کر ہی اٹھتی تھی۔ میم صاحب مجھ سے مچھلی خریدتی ہی نہیں تھیں بلکہ کبھی کبھی تو مجھے پکانے کے لیے بھی کہتی تھیں جس کے لیے مجھے دو آنے فالتو دے دیتی تھیں۔''

''ان کے ساتھ کیا بیتی؟'' للائن نے پوچھا۔

''صاحب اور ان کی لڑکی کو گرجا گھر میں ہی قتل کر دیا گیا تھا جب کہ میم صاحب نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔''

''نہیں۔ یقین کے ساتھ کہہ رہی ہو؟'' للائن نے پوچھا۔

''بالکل!'' عورت نے کہا ''میرے خاوند نے اگلی صبح جب وہ کھنٹ میں مچھلی پکڑنے گیا تھا اس کی لاش کو بہتے دیکھا تھا۔''

لالا رام جی لال کے ہاں آئے ہمیں دو ہفتے ہو چکے تھے۔ اتنے دن میں ہمارے کپڑے گندے ہو گئے تھے اور پھٹ بھی گئے تھے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم

گھر سے کچھ کپڑے اُٹھا لیتے۔ اس لیے کپڑے بدلنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا جب تک کہ ہم ہندوستانی پہناوے کو اپنا نہ لیتے۔ امی نے للائن کے کچھ جوڑے پیٹی کوٹوں کے بدلے اور چند شالیں اُدھار لیں اور اُنھیں ہمارے ناپ کے مطابق سی دیا۔ جب میلے ہو جاتے تو ہم انھیں صحن میں بیٹھ کر دھوڈالتے اور بدن پر چادر وغیرہ لپیٹ لیتے جب تک کہ کپڑے آدھے سوکھ نہیں جاتے۔

امی نے ہمیں ہندوستانی نام دینے میں بھی مصلحت سمجھی۔ میرا نام خورشید رکھا فارسی میں جس کا مطلب سورج ہے اور میری چچازاد بہن کو اس کے ناٹے قد کی وجہ سے ننھی کا نام دیا گیا۔ پلّو کا نام غلام حسین ہو گیا اور اس طرح سے اس کی ماں کو غلام حسین کی ماں کہہ کر پکارا جانے لگا۔ نانی تو بڑی بی تھیں ہی۔ چوں کہ ہم اچھی خاصی اردو بول لیتے تھے اس لیے ہمیں مسلم نام دیے گئے اور نانی تو رامپور کے مسلم گھرانے میں سے ہی تھیں۔ ہم جلد ہی لالا کے گھر میں رچ بس گئے اور وہ لوگ جو ہمیں پہلے سے جانتے تھے اور لباڈور گھرانے کے افراد میں شمار کرتے تھے اب ان کے لیے بھی ہمیں پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔

لالا کے گھر میں اچھی خاصی مستی کا عالم تھا۔ وہاں لالا کا ایک رشتہ دار امرت لال اپنی بیوی رتنا کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ چھوٹے قد کا گٹھا ہوا آدمی تھا۔ اس کی بیوی دراز قد لیکن بدصورت تھی۔ اُس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد وہ ایک نیچ ذات کی عورت کے چکر میں پھنس گیا جو اُن کے یہاں پانی بھرتی تھی اور اسی کی طرح ناٹے قد کے مضبوط عورت تھی۔ اس عورت سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اولاد کی تمنا تو اس کی پوری ہو گئی لیکن سوکنوں کی آپس کی لڑائی میں اُس کا امن چین جاتا رہا۔ پیشے سے وہ جیوتشی تھا۔ ایک دن اس نے اپنے نکشتروں کا حساب لگایا اور گھر بار چھوڑ کر کسی دوسری جگہ قسمت آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس کی دونوں بیویاں چوں کہ اب اکیلی رہ گئی تھیں اس لیے آپس میں صلح صفائی کر کے اکٹھا رہنے لگیں۔ پہلی بیوی سینے پرونے کا کچھ کام کر کے کما لیتی تو دوسری چکی چلا کر۔ اکثر ان میں حسد کی وجہ سے جھگڑا ہو جاتا۔ دوسری بیوی پہلی کو بانجھ ہونے کے طعنہ دیتی تو درزیانی جواباً کہتی جب تو پانی کھینچتی تھی تیرے ہاتھ پاؤں میں چھالے پڑ

گئے تھے۔ اب جب تو پسائی کا کام کرتی ہے تو تیری انگلیاں بھی چھالوں سے بھر گئی ہیں اور کہاں چھالے چاہئیں تجھے؟

اسی اثنا میں امرت لال یوگی ہو گیا تھا اور جیوتشی لگا تا تھا اور ہری دوار میں آرام کی زندگی گزار رہا تھا۔ اُس کا جب کچھ اتا پتا لگا تو دوسری بیوی نے ایک عرضی نویس سے اس کے نام ایک خط لکھوایا اور چوں کہ میں اردو جانتی تھی مجھ سے پڑھنے کو کہا۔ خط کچھ اس طرح سے تھا:

> ''تم تو ایسے غائب ہوئے جیسے جسم سے سرسوں کا تیل غائب ہو جاتا ہے اور اپنی خوشبو چھوڑ جاتا ہے۔ تم اپنے گول مٹول جسم کے ساتھ میرے آگے پیچھے ناچا کرتے تھے۔ تمھاری اُلو کی سی آنکھیں عادتاً مجھے ڈھونڈا کرتی تھیں۔ میرا دھیان اب بھی تمھاری طرف ہے اور یہ خط پا کر بھی کیا تم میری طرف سے غافل رہو گے؟ تم مجھ کو لاڈو، محبوبہ کہہ کر پکارتے تھے۔ کیا تم مجھ سے پیار نہیں کرتے تھے۔ تم مجھے اس سوکھی لکڑی کی سی عورت کے طعنے سننے کے لیے کیوں چھوڑ گئے۔ وہ عورت جسے تم کجروی سے قیمتی پتھر سمجھ کر رتنا کہتے تھے؟ بے وفا کون نکلا تم یا میں؟ تم نے جذبات کے ساتھ یہ کھلواڑ کیوں کی؟ چلو بھر پانی میں ڈوب مرو یا واپس آ کر میری حاسد کو اپنے گلے کا ہار بنا لو یا اپنے بازو پر اس کی موت کا تعویذ بنا کر باندھو تا کہ تمھارے لیے میری محبت کو وہ نہ چھین سکے۔''

اس خط کا اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ شاید اُس نے پھر نجوم لگایا ہوگا اور اپنی بیوی بچوں کو رام جی لال جیسے فیاض رشتہ دار کے رحم و کرم پر چھوڑ کر پہاڑوں پر آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا ہوگا۔

گرمی اپنے پورے شباب پر تھی اس لیے لالا اور اس کے گھر والے سبھی باہر صحن میں ہی سوتے تھے۔ ہم بھی کافی لوگ تھے۔ امی کے علاوہ باقی لوگ تو اچھی طرح سوتے تھے۔ امی چاہے دن میں آرام کر لیتی تھیں لیکن ہماری خاطر راتیں جاگ کر ہی کاٹتی

تھیں۔ رات رات بھر انھیں جاگتے دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا تھا۔ خطرے کا خیال ان کے دل میں پہلے جیسا ہی بنا ہوا تھا۔ لالا ہاتھ جوڑ کر ان سے التجا کرتا ''مریم۔ تم سو جاؤ۔ ارے میں ماتھر نہیں اگر آپ لوگوں کا دھیان نہ رکھوں۔'' لیکن امی نے لالا سے صرف ایک چاقو مانگا جسے وہ اپنے سرہانے رکھنا چاہتی تھیں۔ لالا نے انھیں ایک زنگ آلود چاقو تھما دیا جسے صاف کرنے اور دھار لگانے میں امی نے بڑی محنت کی۔

اور ایک دن آ گیا جب امی نے چاقو استعمال کرنے کی دھمکی دی۔ رات کے دس بجے تھے۔ امی کے علاوہ سبھی لوگ سو گئے تھے اور وہ میری چارپائی کی پائینتی پر بیٹھی تھیں۔ مجھے نیند کے جھونکے آ ہی رہے تھے کہ امی نے کہا کہ انھیں چمیلی کے پھولوں کی خوشبو آ رہی ہے جب کہ گھر کے نزدیک کہیں بھی چمیلی کا پودا نہیں تھا۔ اسی وقت اونچی دیوار سے مٹی کا ایک ڈھیلا گرا اور جیسے ہی ہم نے اوپر دیکھا ایک آدمی دیوار پر بیٹھا تھا۔ ایک اور آدمی تھوڑی دوری پر صحن میں لگے نیم کے درخت کے سائے میں چھپا ہوا تھا۔ امی نے تکیے کے نیچے سے اپنا چاقو نکال لیا اور للکار کر کہا کہ اگر کسی نے ہمیں ہاتھ بھی لگایا تو وہ چاقو اس کے سینے میں گھونپ دے گی۔ اپنے بچوں کی حفاظت کر رہی شیرنی کی طرح امی کے خون آشام ارادے سے گھبرا کر گھس بیٹھیے چپکے سے رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

اس واقعہ نے ہمیں یہ یقین دلا دیا کہ لوگوں کو ہمارے وجود کا علم ہے اور ہم ابھی خطرے سے باہر نہیں۔ کچھ دن بعد ایک اور بات ہوئی جس سے ہم اور بھی زیادہ گھبرا گئے۔

ہماری ایک نوکرانی لاڈو جو ہمارے ساتھ آئی تھی لالا کی اجازت سے ایک کونے میں پناہ گزیں تھی۔ اس کی لڑکی کی شادی تلواریں تیز کرنے والے ایک شخص سے ہوئی تھی اور وہ بغاوت کے دن سے اسے ادھر ادھر تلاش کر رہا تھا۔ اُسے جب پتا چلا کہ لالا کے گھر میں کچھ فرنگی ٹھہرے ہوئے ہیں تو وہ ۲۳/جون کو لالا کے گھر پر آ گیا اور بولا: ''مجھے پتا چلا ہے کہ میری ساس تمھارے گھر میں ہے۔ میں نے ہر جگہ اس کا پتا لگایا اور لوگوں نے بتایا

کہ انھوں نے اسے ادھر ہی آتے دیکھا تھا۔ اچھا تو یہ ہوگا لالا جی کہ اُس کو میرے ساتھ بھیج دو ورنہ میں تمھارے لیے مصیبت کھڑی کر دوں گا۔''

لالا نے لاڈو کے بارے میں کچھ کہنے سے انکار کر دیا تو وہ آدمی گھر کی تلاشی لینے پر بضد ہو گیا۔

''تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' لالا نے کہا۔ ''ارے بدتمیز چلا جا یہاں سے۔ میرے زنانہ میں داخل ہونے کی بات کہنے کی تو نے ہمت کیسے کی؟''

وہ آدمی غصہ میں واپس چلا گیا۔ اُس نے دھمکی دی کہ وہ نواب سے کہہ کر سپاہیوں کو پھر لے کر آئے گا۔ لاڈو کو جب اس بات کا پتا چلا تو وہ کمرے میں آ کر امی کے پاؤں پر گر گئی اور کہا کہ وہ یہاں سے چلی جائے گی تاکہ اس کا داماد کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی کر دے۔ وہ میرے لیے اور چچازاد بہن کے لیے دعا دیتی روتی ہوئی چلی گئی۔ بچاری لاڈو! وہ کئی سالوں سے ہمارے پاس تھی اور ہم سب اسے چاہنے لگے تھے۔ ہماری مصیبت کے دنوں میں اپنی وفاداری کا ثبوت دے کر اس نے ہمارے دلوں کو جیت لیا تھا۔

شام کو جب لالا گھر لوٹا تو اس نے ہمیں بتایا کہ لاڈو پر کیا بیتی۔ وہ شہر میں اپنے داماد کے ہاں گئی تھی۔

''تم کہاں چلی گئی تھیں اماں؟'' اس نے پوچھا۔ ''میں ہر جگہ تمھیں تلاش کر رہا تھا۔ تم اچانک کہاں سے آ ٹپکیں؟''

''میں ابھی ابھی فتح گڑھ سے آ رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کیا ماں، فتح گڑھ میں بھلا کیا لینے گئی تھیں؟ اور ان انگریزوں کا کیا ہوا جن کے ہاں تم کام کرتی تھیں؟''

''ارے بھئی، مجھے کیا معلوم ان کا کیا ہوا۔'' لاڈو نے کہا ''میرا خیال ہے وہ تو سب مارے گئے تھے۔ ایک آدمی نے تو لباڈور میم صاحب کو کھناٹ میں ڈوبتے بھی دیکھا تھا۔''

نواب نے ہماری اس پرانی نوکرانی کا اچانک آنے کا سنا تو اس نے اسے بلا بھیجا اور اچھی طرح سے اس سے سوال جواب کیے لیکن لاڈو یہی رَٹ لگائے رہی کہ وہ کچھ نہیں جانتی کہ ہمارے ساتھ کیا بیتی۔

نواب نے اسے برا بھلا کہا۔ ''یہ نامراد میرے سامنے جھوٹ بول رہی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اسے سب معلوم ہے کہ کون کہاں ہے لیکن بتائے گی نہیں۔ قسم خدا کی، اگر تم مجھے ان کے بارے میں سب کچھ نہیں بتادوں گی تو میں تمھارا سر قلم کردوں گا۔ سنا تم نے؟''

''میرے آقا!'' لاڈو نے سر سے پاؤں تک کانپتے ہوئے کہا۔ ''جس چیز کا مجھے علم نہیں وہ میں آپ کو کیسے بتا سکتی ہوں۔ یہ سچ ہے کہ جب ان کا مکان جل رہا تھا تو میں بھی ان کے ساتھ ہی وہاں سے نکلی تھی مگر اس کے بعد وہ لوگ کہاں گئے، مجھے کچھ پتا نہیں۔''

''یہ شیطان کی اولاد!'' نواب نے غصے سے کہا۔ ''یہ مجھے زیادہ کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ یہ سچائی کو چھپا رہی ہے۔ اچھی بات ہے اسے اپنی کرنی کی سزا ملنی ہی چاہیے۔''

دو آدمیوں نے بھاگ کر لاڈو کے بال پکڑ لیے اور تلوار اس کی گردن پر رکھ دی۔ بیچاری کو ان دونوں کی پکڑ سے تکلیف ہو رہی تھی اور وہ اپنی معصومیت کا اظہار کرتے ہوئے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔

''مجھے آپ کے سر کی قسم آقا میں کچھ نہیں جانتی۔''

''تو میرے سر کی قسم بھی کھانے لگی۔'' نواب نے آگ بگولہ ہو کر کہا۔ ''اچھا تو، تو اس تلوار سے بھی نہیں ڈرتی، ظاہر ہے تجھے کچھ نہیں معلوم، چھوڑ دو اسے۔''

اور بیچاری لاڈو کو جو خوف سے نیم مردہ ہوگئی تھی رہا کر دیا گیا اور اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔

ایک دوسرا نواب

۲۴ر جون کو ڈھول پیٹنے جا رہے تھے اور دور کہیں سے آ رہیں ڈھول اور بانسری کی

آوازیں ہمارے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ فساد شروع ہونے کے بعد سے یہ جانی پہچانی آوازیں سنائی دینا بند ہوگئی تھیں اور اب ہم حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ سڑک پر خوب ہنگامہ برپا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بھی کانوں میں پڑ رہی تھی۔ ہم بے تابی سے لالا کے لوٹنے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ معاملے کا کچھ پتا چلے۔

''کوئی دوسرا نواب آ رہا ہے کیا؟'' امی نے پوچھا۔ ''ہم لوگوں کا کیا ہوگا؟''

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ غلام قادر خان سابق نواب سے مختلف نہیں اور پھر دونوں ایک ہی خاندان سے ہیں۔ دونوں ہی کمپنی کی حکومت کے خلاف تھے۔ فرق اتنا ہے جہاں قادر علی عیاش و آوارہ اور نااہل ثابت ہوا ہے، وہاں غلام قادر میں قوت ہے اور پرہیزگاری بھی ہے۔ لیکن اس نے بھی فرنگیوں کو اس سرزمین سے اکھاڑ پھینکنے کا ارادہ بنا رکھا ہے۔۔۔''

''غدر شروع ہونے کے وقت وہ اودھ میں تھا جہاں وہ گاؤں کے لوگوں کو غیر ملکی جوا اتار پھینکنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ وہ قادر علی کے ساتھ مل کر یہ کام کر سکتا تھا اگر ان میں نااتفاقی نہ ہوتی۔ غلام قادر عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کے خلاف تھا لیکن قادر علی نے اس کی نہ چلنے دی اور غلام قادر کچھ عرصے کے لیے اس سے الگ ہو کر حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ اب بہت سے طاقتور زمیندار، نظام علی خان، وِٹل سنگھ، عبدالرؤف اور وہ بدمعاش جاوید سب اس کے ساتھ ہوگئے ہیں۔ کل وہ شاہ جہاں پور میں داخل ہوا اور حکمراں بن بیٹھا۔ آج صبح مشہور باغی نئے نواب کے دربار میں پیش ہوئے ہیں اور آج رات نواب نے جشن کا انتظام کیا ہے۔''

''تمھارا کیا خیال ہے لالا۔ وہ ہمیں پریشان تو نہیں کرے گا؟'' نانی نے متفکرانہ انداز سے پوچھا۔ ''ہم غریب لوگوں کو قتل کر کے اسے کیا ملے گا؟''

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا بڑی بی۔'' لالا نے کہا ''سابق نواب کی طرح وہ بھی چند کافروں کو تہہ تیغ کر کے شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن شہر میں یہ خبر بھی مشہور ہے کہ وہ کسی گہرے غم میں ڈوبا ہوا ہے.....''

''کیا غم؟'' امی نے پوچھا۔ ''اس کی بیوی مرگئی ہے کیا؟ اب جب کہ وہ نواب کی گدی پر بیٹھ گیا ہے تو دوسری شادی کرسکتا ہے اور پھر اس کے غم سے ہمیں کیا مطلب؟''

''غم اس کے ارادوں پر اثر تو ڈال سکتا ہے۔'' لالا نے کہا۔ ''افواہ تو یہ بھی ہے کہ اس کی خوبصورت جوان لڑکی کو اغوا کرلیا گیا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں پر ہے۔''

''اور اس کا عاشق؟'' امی جو دوسروں کے عاشقانہ معاملوں میں دلچسپی رکھتی تھیں، تجسس سے پوچھا۔

''لوگ کہتے ہیں کہ قادر علی کا ایک بیٹا فرحت بھی اسی وقت غائب ہوگیا تھا۔ شبہ یہی ہے کہ وہی لڑکی کو لے کر بھاگا ہے۔''

''اوہ! فرحت کو میں جانتی ہوں۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان ہے جو اکثر ہمارے گھر کے سامنے سے چتکبرے گھوڑے پر سوار ہوکر گزرتا تھا۔ خیر ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔''

''میں بھی یہی کہنے والا تھا مریم۔'' لالا نے کہا۔ ''جیسے ہی نواب نے گدی سنبھالی اور دربار لگایا تو کچھ مخبروں نے اسے لاڈو کی کہانی سنائی اور مشورہ دیا کہ تم لوگ میرے گھر میں چھپے ہوئے ہو، اس لیے میرے گھر کی تلاشی لی جائے۔ نواب خود بھی لباڈور صاحب کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کیوں کہ صاحب اس کی نظروں میں بے ضرر و مسکین شخصیت کے آدمی تھے۔ اُسے جب یہ بتایا گیا کہ صاحب قتل کردیے گئے تھے تو نواب نے کہا کہ ٹھیک ہے تو ہمیں اب ان کی عورتوں کو تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں معصوم لوگوں کے قتل میں شریک نہیں ہونا چاہتا۔''

''لیکن اس کے اس مزاج پر کب تک اعتبار کیا جاسکتا ہے؟'' امی نے کہا۔

''نظام علی خان نے مجھے بتایا کہ نواب نے اپنی لڑکی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ فرنگیوں کی عورتوں اور بچوں پر ہاتھ نہیں اُٹھائے گا۔ ہے تو یہ ناممکن سی بات، لیکن میرے خیال میں نظام علی کی اطلاع قابل یقین ہوتی ہے۔''

''یہ تو سچ ہے۔'' امی نے کہا۔ ''میرے خاوند اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ کئی سالوں تک اس کا صحن ہمارے قبضے میں تھا اور ہم باقاعدہ اس کا کرایہ دیتے تھے۔''

''خیر نواب اب بھی اسے پسند کرتا ہے۔'' لالا نے کہا۔ ''اس نے اسے اپنے ذاتی اسلحہ خانے میں بندوقیں بنانے کا کام دیا ہے۔ اگر نواب نظام علی جیسے آدمیوں پر بھروسہ رکھتا ہے تو قادر علی خاں کے مقابلے میں وہ عوامی مسائل کی طرف اچھی طرح سے دھیان دے سکتا ہے۔''

ہم اپنی روزمرہ کی ضروریات کے لیے لالا پر منحصر تھے اور امی کے پاس اگرچہ اس کے زیوروں کے بکسے میں کچھ روپیہ تھا جو وہ اپنے ساتھ لائی تھیں تاہم وہ اس روپے کو بڑی کنجوسی سے خرچ کرنا چاہتی تھیں۔

ایک دن لالا نے ہاتھ جوڑ کر کہا ''مریم مجھے کہتے ہوئے شرم محسوس ہورہی ہے کہ میرے پاس اب روپیہ پیسہ نہیں رہا۔ دھندا تو چوپٹ ہوگیا ہے، اور جتنا روپیہ میں نے بچا کر رکھا ہوا تھا۔ سارا ختم ہوگیا ہے۔''

''پریشان مت ہو لالا۔'' امی نے کہا اور صندوقچی میں سے سونے کا ایک پترا نکال کر اس کو دیا۔ یہ سونا بازار میں لے جاؤ اور جو کچھ بھی ملے، اتنے میں اسے بیچ آؤ۔''

لالا کو کچھ شرمندگی محسوس ہوئی۔ لیکن اچانک اس مدد کے ملنے پر اسے مسرت بھی ہوئی۔

''میں ابھی بازار جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اس سونے کا کتنا روپیہ ملتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن مریم میرا ایک مشورہ بھی ہے۔ ہم سب بریلی چلے چلیں۔ وہاں پر میرا ایک بھائی ہے اور تمھارے بھی کچھ رشتہ دار ہیں وہاں۔ کم از کم وہاں ہم مکان کا کرایہ دینے سے تو بچ جائیں گے جو یہاں دے رہے ہیں۔ اگر تمھیں منظور ہے تو میں دو گاڑیاں کرائے پر لے لیتا ہوں اور ہم سب اس میں سما جائیں گے۔''

ہم سب کو لالا کے مشورے سے اتفاق تھا اور وہ خوشی خوشی بازار کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس بات سے بے خبر کہ ہماری حفاظت کے لیے اس کے منصوبوں پر پانی پھر جائے گا۔

آخر پکڑے گئے۔

ہم لگ بھگ ایک ماہ تک لالا کے گھر میں رہے اور آج اس کے یہاں ہمارا آخری دن تھا۔ حسبِ معمول ہم سب لوگ ایک ہی کمرے میں بیٹھے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ باہر سے ہمیں کچھ آوازیں سنائی دیں۔

''دروازہ کھولو!'' کوئی باہر سے چلا رہا تھا اور زور زور سے صدر دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

ہم نے کوئی جواب نہیں دیا اور گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ للائن جو ہمارے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی، اُٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی اور باہر سے دروازہ پر کنڈی چڑھا دی۔

''کھولو، نہیں تو ہم دروازہ توڑ دیں گے۔'' باہر سے آواز آئی اور دستک پہلے سے زیادہ تیز ہوگئی۔

آخر کار رَتنا نے صدر دروازہ کھول دیا۔ بیس تیس آدمی تلواروں اور پستولوں سے لیس اندر گھس آئے۔ ایک آدمی نے جو غالباً باہر زیادہ شور کر رہا تھا اور ان کا سردار تھا، عورتوں کو چھت پر جانے کا حکم دیا کیوں کہ وہ بھگوڑی فرنگی عورتوں کو ڈھونڈنے کے لیے باقی سبھی کمروں کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔ لالا کے گھر والوں کے پاس چھت پر جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ لوگ اب ہمارے دروازے کی طرف بڑھے اور کنڈی کھول دی۔ گروہ کا سردار دھماکے سے دروازہ کھول کر ہاتھ میں ننگی تلوار لیے کمرے میں گھس آیا۔

''لباڈور کی بیٹی کہاں ہے؟'' اس نے امی کے بازو کو زور سے پکڑتے ہوئے کہا اور اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔ ''نہیں۔ یہ وہ نہیں ہے۔'' اس نے ہاتھ چھوڑ دیا اور میری طرف گھورنے لگا۔

''یہ رہی وہ لڑکی!'' وہ میرا ہاتھ پکڑ کر امی کے پاس سے گھسیٹتا ہوا باہر صحن میں روشنی میں لے آیا۔ تلوار اس کے دائیں ہاتھ میں اُٹھی ہوئی تھی۔

''نہیں.....'' امی میرے آگے آ کر کھڑی ہوگئیں اور کرب انگیز آواز میں چلائیں۔ ''میری بیٹی کی جان لینے سے پہلے تمھیں مجھے قتل کرنا ہوتا۔ میں علی کی تلوار کی قسم کھا کر کہتی ہوں!''

امی کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور ڈیلے باہر نکل آئے تھے۔ وہ شاہانہ اور غضبناک لگ رہی تھی۔ امی کو دیکھ کر مجھے اس آدمی کی ننگی تلوار سے زیادہ ڈر لگ رہا تھا لیکن میں قصداً اس کے ساتھ چپکی رہی اور اس آدمی کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ امی کے جذبے سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے تلوار نیچے گرا دی اور ترش روئی سے ہمیں اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا اگر ہمیں اپنی جانیں پیاری ہیں تو۔ نانی ناامیدی میں اپنے ہاتھ مل رہی تھیں جب کہ دوسری عورتیں ایک کونے میں چھپی رہیں اور پلّو جو اکیلا لڑکا تھا کو اپنی اوڑھنیوں میں چھپائے رکھا۔ وہ تلوار دھاری آدمی، امی اور مجھ کو گھر سے باہر لے آیا۔ اس کے پیچھے اس کے حواری بھی آ گئے۔

جون کے مہینے کا آخر تھا لیکن مانسون کی بارش کا کہیں نام ونشان تک نہیں تھا۔ دوپہر ہونے کو تھی اور سورج بڑی شدت سے گرمی برسا رہا تھا۔ زمین سخت خشک اور گرد آلود ہو رہی تھی۔ ننگے پاؤں اور ننگے سر ہم اپنے پکڑنے والے کے پیچھے چل رہے تھے بھیڑوں کے گلے کی طرح جنھیں ذبح کرنے کے لیے لے جایا جا رہا ہو۔ اس کے دوسرے ساتھی سورج کی روشنی میں چمکتی تلواریں ہاتھوں میں لیے ہمیں گھیرے ہوئے تھے۔ ہمیں کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔

ہم ابھی آدھا میل چلے ہوں گے مگر ہمارے پاؤں پر تپتی ہوئی سڑک پر چلنے سے چھالے پڑ گئے تھے۔ ہمارے گرفتار کنندہ ایک چھوٹی سی مسجد کے نزدیک اِملی کے درخت کے نیچے رُک گئے اور ہمیں بھی تھوڑا آرام کرنے کے لیے کہا۔ ہم نے کہا کہ ہمیں پیاس لگی ہے۔ پیتل کے برتن میں پانی ہمارے سامنے پیش کیا گیا۔ کچھ متجسس لوگوں کی بھیڑ ہمارے گرد اکٹھا ہوگئی تھی۔

''یہ فرنگی خواتین ہیں جو لالا کے مکان میں چھپی ہوئی تھیں۔ دیکھو تو کتنی خوف زدہ

لگ رہی ہیں۔ایک تو جوان ہے۔اس کی آنکھیں بڑی خوبصورت ہیں۔دیکھو بالکل ماں کی آنکھوں کی طرح!''

اس گروہ میں ایک پیر بھی تھا جس نے ہمارے پکڑنے والے کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا: ''جاوید تم ان بدقسمت عورتوں کو اپنی عیاشی کے لیے پکڑ کر لائے ہو۔وعدہ کرو کہ تم ان عورتوں کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کرو گے اور نہ ہی ان کا قتل کرو گے۔''

''اچھا تو یہ جاوید خان ہے۔'' امی نے آہستہ سے کہا۔

جاوید خان جس کا منہ ابھی تک ڈھکا ہوا تھا تلوار کو اپنے منہ کے سامنے لا کر بولا: ''میں اس تلوار کی قسم کھاتا ہوں کہ میں ان کو ماروں گا نہیں اور نہ ہی ان کے ساتھ کسی قسم کا برا سلوک کروں گا۔''

''اپنے ضمیر پر پکے رہنا جاوید۔'' پیر نے پھر کہا: ''تم نے قسم اُٹھائی ہے اور پٹھان جب تک زندہ ہے اپنے قول پر پکا رہتا ہے۔دیکھو ان دونوں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ایسا نہ ہو کہ تمھاری اپنی زندگی مختصر ہو جائے۔''

''اس بات سے آپ بے فکر رہیں۔'' جاوید نے کہا اور ہمیں اُٹھنے کا اشارہ کیا۔

ہم پھر اس کے پیچھے چلنے لگے۔لوگوں کی بھیڑ وہیں کھڑی رہی۔ہم جلال نگر کی تنگ گلیوں میں سے گزر رہے تھے جہاں زیادہ تر آبادی پٹھانوں کی تھی۔

کئی گلیاں پار کر کے ہم ایک چھوٹے چوراہے پر آ گئے جس کے ایک کونے پر ایک گھوڑا بندھا تھا۔جاوید خان نے گھوڑے کے پٹھے پر تھپکی دی۔اپنے گھر کا دروازہ کھولا اور ہمیں اندر جانے کے لیے کہا، پھر وہ خود بھی ہمارے پیچھے اندر آ گیا۔صحن میں ایک جوان عورت جھولے پر بیٹھی تھی، وہ ہمیں دیکھ کر ایک دم حیران ہو گئی۔

''یہ فرنگی خواتین ہیں۔'' جاوید نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا اور بے تکلفی سے صحن پار کر گیا۔

ایک بوڑھی عورت امی کے پاس آئی۔''ڈرو مت بی بی۔یہاں بیٹھ کر تھوڑا آرام کر لو۔'' اس نے کہا۔

جاوید خان

ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدلنے کے بعد جاوید اپنے زنان خانے میں آیا تو اپنی بیوی سے کہنے لگا ''کیا کہتی ہو ان فرنگنوں کے بارے میں؟ میں نے کہا تھا نا کہ، جب تک میں ان کو ڈھونڈ نہ نکالوں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا؟ اور کوئی معمولی آدمی ہوتا تو بہت پہلے ہی ان کی تلاش چھوڑ دیتا۔'' بغلیں بجاتا ہوا وہ ناشتہ کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ناشتہ اس کے سامنے ایک لکڑی کے پھٹے پر رکھ دیا گیا۔

اس کی بوڑھی چاچی جس نے ہمیں خوش آمدید کہا تھا اور جو کوٹھی والی کے نام سے جانی جاتی تھی امی سے مخاطب ہوئی۔

''بی بی۔اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔کون لوگ ہو تم؟'' اس نے پوچھا۔

''ہم جو ہیں وہ تم دیکھ رہی ہو۔'' امی نے کہا۔''اب ہم دوسروں کے محتاج ہیں۔تمھارے اس رشتہ دار کے رحم و کرم پر ہیں۔جب اس کے جی میں آئے وہ ہمیں قتل کر سکتا ہے۔''

''کون لینا چاہتا ہے تمھاری جان؟'' جاوید خان بیچ میں بول اٹھا۔

''جب تک میں یہاں ہوں تم محفوظ ہو۔'' کوٹھی والی نے کہا۔''تم مجھ سے بے دھڑک ہو کر سب کچھ بتا سکتی ہو۔تمھارا اور تمھارے ساتھ اس لڑکی کا کیا نام ہے؟''

''یہ خورشید ہے۔میری اکلوتی بیٹی۔میرا نام مریم ہے اور رامپور کے مشہور خاندان سے ہوں جہاں میرا باپ نواب کا وزیر تھا۔''

''کون سا رامپور؟'' جاوید کی بیوی خان بیگم نے پوچھا۔

''روہیلوں کا رامپور!'' امی نے کہا۔

''اچھا وہ والا رامپور!'' امی کے شجرۂ نسب سے متاثر ہو کر خان بیگم نے کہا۔''یہ میری بچی ایک انگریز کے نطفے سے ہے۔'' امی نے میری طرف ایک پیار بھری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔''جس دن بغاوت ہوئی اس کا باپ گرجا گھر میں قتل کر دیا گیا تھا۔میں بیوہ ہو گئی اور یہ بچی بن باپ کی۔لالا رام جی لال نے ہم پر مہربانی کی اور ہماری جانیں بچا لیں۔ہم

اس کے مکان میں رہ رہے تھے جب تمھارا یہ رشتہ دار ہمیں زبردستی وہاں سے نکال لایا۔ میری ماں اور گھر کے باقی لوگ ابھی بھی وہیں پر ہی ہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے اب ہمارا کیا ہوگا۔ ہمارا اس دنیا میں اب کوئی سہارا نہیں۔''

امی جذباتی ہو کر رونے لگی۔ میرا بھی دل بھر آیا اور میں امی کی اوڑھنی میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔

کوٹھی والی کو ہم پر ترس آ گیا۔ میرے سر پر شفقت اور ہمدردی بھرا ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''مت رو۔ میری بچی مت رو۔''

امی نے اپنے آنسو پونچھے اور بڑھیا کی طرف دیکھا۔ ''ہم بڑی مصیبت میں ہیں پٹھانی۔'' وہ بولیں۔'' ''ہماری زندگیاں بخش دو اور ہمیں بے حرمت ہونے سے بچاؤ۔ میری تم سے یہی التجا ہے۔''

جاوید خان جو ہمارے رونے دھونے سے پریشان ہو گیا تھا کہنے لگا۔ ''اے نیک خاتون تم فکر مت کرو۔ کوئی تمھیں قتل نہیں کرے گا۔ میں تمھیں اس بات کا یقین دلاتا ہوں، بلکہ میں نے دوسروں کے ہاتھوں تمھاری بیٹی کو بے حرمت ہونے سے بچا لیا ہے۔ جب تم چاہو میں اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

جاوید خان کی بیوی کے ہاتھ سے پلیٹ گر گئی۔ جاوید نے اس کی طرف غصے بھری نظر سے دیکھا۔ ''بے وقوف مت بنو، قابل!'' وہ بولا۔

امی کے کچھ کہنے سے پہلے کوٹھی والی بولی ''تمھیں ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا جاوید۔ یہ دونوں اچھے گھر سے ہیں اور پریشان بھی ہیں۔ دیکھو تو کتنی گھبرائی ہوئی اور پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔ ان سے ہمدردی سے پیش آؤ اور ان کی اس حالت میں توہین مت کرو۔ میرا تم سے یہ کہنا ہے۔''

''یقین رکھو چاچی۔'' اس نے کہا ''مجھے ان سے پوری ہمدردی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ اپنی شان و شوکت کھو بیٹھی ہیں۔''

''میں یہ جاننا چاہتی ہوں تم ان سے ملے کیسے؟'' کوٹھی والی نے پوچھا۔ ''دوسری

عورتوں کی طرح تمھاری بیوی خان بیگم کیا اچھی عورت نہیں ہے؟ دیکھو تم کیسی تیکھی ناک ہے اس کی!''

''میں کب کچھ کہہ رہا ہوں؟'' لیکن چاچی وہ بولا ''میں کیسے بتاؤں چاچی کہ اس لڑکی نے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا جب میں نے اس کے باپ کے گھر میں اسے دیکھا تھا۔ پہلی بار اس کو دیکھتے ہی اس کی خوبصورتی کا قائل ہو گیا تھا۔ وہ صبح کے تارے زہرہ کی طرح لگی تھی مجھے اور اب جب میں اس کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے وہ کہاوت سچ ہی لگتی ہے کہ پھول اپنی ٹہنی پر ہی خوبصورت لگتا ہے اور ٹوٹتے ہی مرجھا جاتا ہے۔ یقین مانو یہ اب بھی وہی فرشتہ صورت لگتی ہے جیسا میں نے اسے ایک مہینے پہلے دیکھا تھا۔''

''تم نے اس کو اس کے باپ سے جدا کر کے بڑی بھول کی جاوید۔ کلی کو پھول بننے سے پہلے ہی تم نے توڑ دیا۔'' خان بیگم نے کہا۔

''کیا بک رہی ہو تم قابل۔'' جاوید تیز سے بولا۔ ''خبردار اگر دوبارہ یہ بات دہرائی! میرے اندر کا شیطان ابھی سویا پڑا ہے اور اتنی سی بات پر جاگ پڑے گا۔''

اس نے میری طرف درد بھری نگاہ ڈالی اور میں اس کے چہرے سے اپنی نظر ہٹا نہ سکی۔ میری حالت اس زخمی پرندے کی سی تھی، چکی ناگ جس کی نظروں کو افسوں زدہ کر دیتا ہے۔ امی کو اس طرح گھور رہی تھیں کہ اس کی بدکار روح کو کچل کر رکھ دیں گی اور وہ امی کی درشت نگاہوں کے سامنے کھڑا رہا۔

''مجھے کوئی معمولی قاتل خیال مت کرنا۔'' نادمانہ طور پر اس نے کہا۔ ''میں نے صرف کافروں کا، اپنے لوگوں کے دشمنوں کا قتل کیا ہے۔ اس کے لیے میں کسی قصور کا نہیں بلکہ شاباش کا مستحق ہوں۔''

''زیادہ جوش میں مت آؤ۔'' کوٹھی والی پھر مخل ہوئی۔ ''میں تو تمھیں یہ بتانا چاہتی تھی کہ اگر تم خوبصورتی کے اتنے ہی پجاری ہو تو تمھاری خان بیگم نہ تو بدصورت ہے اور نہ ہی کالی۔ میں تو سمجھی تھی کہ فرنگی عورتوں کی آنکھیں نیلی اور بال نرم ہوتے ہیں مگر یہ بیچاریاں تو دیکھو کتنی خوف زدہ ہیں اور بالکل ہماری جیسی لگ رہی ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ٹھیک ہے۔'' جاوید ذرا سخت لہجے میں بڑبڑایا۔''قابل کی خوبصورتی کی اتنی بڑھ چڑھ کر تعریف نہ کرو۔ مجھے معلوم ہے وہ کتنی حسین ہے۔چھوڑو اس بات کو لیکن چاچی۔'' وہ میری طرف نرم نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔''کاش تم نے اس لڑکی کو اس وقت دیکھا ہوتا جب میری نظر پہلی بار اس پر پڑی تھی۔ یہ گلاب کا پھول تھی جسے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا ہلا سکتا تھا۔ یہ ایک معصوم ہرنی کی طرح تھی.....''

''تم اپنی بکواس بند نہیں کرو گے؟'' کوٹھی والی مخل ہوئی۔''اس کی طرف دیکھو اور بتاؤ کیا وہ ایسی لگتی ہے جیسے تم کہہ رہے ہو۔''

''واللہ! کچھ تبدیلی آ گئی ہے اس میں۔'' جاوید نے حیران ہو کر جواب دیا اور پھر شاعرانہ انداز اختیار کیا۔''وہ اب وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ایک ہی مہینے میں وہ اپنی عمر سے بیس سال بڑی لگنے لگی ہے۔لالا کے گھر میں جب میں نے اس کا بازو پکڑا تھا تو وہ بے ہوش ہونے کو تھی لیکن اس کی ماں کی آنکھوں میں جو وحشت طاری تھی اُس کا بیان نہیں کر سکتا۔ وہ غصے میں اس شیرنی کی طرح سے تھی جس کے جسم کا ایک حصہ کانٹے دار تیر سے زخمی ہو گیا ہو۔اس نے اپنی چھاتیاں میری تلوار کی نوک پر رکھ دی تھیں۔لڑکی کے پاس سے مجھے ہٹاتے ہوئے اس نے جو آنکھیں مجھ پر گاڑی تھیں، وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں واقعی ڈر گیا تھا۔کمزور پڑ گیا تھا۔میری مردانگی ختم ہو گئی تھی۔تلوار میرے ہاتھ سے گرنے کو تھی۔اس کی رگوں میں یقیناً کسی جانباز کا خون ہے۔ یہ کوئی معمولی عورت نہیں۔'' اور امی پر ایک مہربانی کی نظر ڈالتے ہوئے وہ بولا''تم پر ہزار مہربانیاں قربان اے عورت!''

پٹھانوں کے یہاں مہمانداری

''میرا خیال ہے تم اور میں ایک اچھے دوست بن سکتے ہیں۔'' کوٹھی والی نے امی سے کہا''تمھاری لڑکی تو مجھے بہت اچھی لگی ہے۔آؤ بیٹی، میرے پاس آؤ۔'' میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے کہا۔

جاوید خان کھانا کھا کر باہر صحن میں چلا گیا تھا۔اس کی بیوی اور چچی کو ہمارے ساتھ کھانا کھانا تھا۔ہم اگرچہ بھوکے اور پیاسے تھے، لیکن ہمارا کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، کیوں کہ نانی اور میری بہن آنیٹ کی ہمیں کچھ خبر نہیں ملی تھی۔ پھر بھی ہم نے اپنی طاقت کو بنائے رکھنے کے لیے تھوڑا بہت کھایا۔ جاوید خان دوبارہ اندر آیا تو یہ جان کر خوش ہوا کہ ہم نے اس گھر کا کھانا کھایا ہے۔

''تم میرے گھر کا نمک کھا چکی ہو اس لیے اب تم ہمارے لیے اجنبی نہیں ہو۔اب تم اسی گھر میں بس جاؤ۔''

''کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔لیکن میرے ساتھ دوسرے لوگ بھی تو ہیں۔ میری ماں ہے، بھانجی ہے۔ان کے بغیر ایک لقمہ بھی منہ میں ڈالنا زہر لگتا ہے۔'' امی نے کہا۔

''گھبراؤ نہیں وہ بھی آ جائیں گے۔'' جاوید بولا۔''تمھاری بیٹی کو تو میں نے فساد شروع ہونے سے بہت پہلے دیکھا تھا اور میں اس پر مرمٹا تھا۔ایک بدمعاش اسے اغوا کر کے لے جانا چاہتا تھا۔اگر مجھے پہلے سے اس کا علم نہ ہوتا تو وہ اسے اٹھا کر لے بھی جاتا۔ میں تم لوگوں کو یہاں بری نیت سے لے کر نہیں آیا ہوں۔تم جب بھی رضامند ہو میں خورشید سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ میں اسے بیوی کا رتبہ دوں گا۔''

''لیکن تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟'' امی نے پوچھا۔''تم تو پہلے ہی سے شادی شدہ ہو۔''

''ایک سے زیادہ بیوی رکھنے میں کون سی رکاوٹ ہے؟ ہمارا قانون اس کی اجازت دیتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔مگر تم مسلم ہو اور ایک مسلمان کی عیسائی لڑکی سے شادی کیسے ممکن ہے؟'' امی نے کہا۔

''ایسی کوئی وجہ نہیں کہ میں یہ شادی نہیں کر سکتا۔'' جاوید نے جواباً کہا۔''پٹھان لوگ کسی بھی قوم کسی بھی نسل کی لڑکی سے شادی کر سکتے ہیں.....اور.....'' اس کی بیوی نے تنک مزاجی سے'اوہ!' کہا اور وہ ذرا رُک کر پھر بولا.....''میری بیوی کی کیا ہمت ہے کہ وہ

میرے اس معاملے میں دخل دے۔ میرے باپ نے بھی تو ایک نیچ ذات کی خوبصورت آنکھوں والی عورت سے شادی کی تھی اور یہ چھوکرا سیف اللہ اسی کے بطن سے ہے۔ خدا کی مار اس پر.....! اور یہ کوٹھی والی نیچ ذات کی ایک ہندو عورت تھی جس کی نزاکت نے میرے چچا کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ میں اگر ایک عیسائی لڑکی سے شادی کرلوں تو اس میں کیا حرج ہے؟''

اس کا منہ توڑنے کے لیے امی کے ترکش میں بہت تیر تھے لیکن یہ دلیلیں پیش کرنے کا وقت نہیں تھا۔ بات کو ابھی ٹالنے میں ہی مصلحت تھی۔

''مجھے یقین ہے تمھیں اپنی بات کا جواب اتنی جلدی نہیں چاہیے۔'' امی نے کہا۔

''میرا خاوند اس دنیا میں نہیں رہا۔ اب مجھے صلاح مشورہ دینے والا کوئی نہیں۔ کیوں نہ اس بات کو کسی دوسرے وقت کے لیے ملتوی کردیں۔''

''مجھے بھی کوئی جلدی نہیں۔'' جاوید نے فوراً جواب دیا۔ ''اتنی اہم بات کا فیصلہ ایک ہی دن میں تو نہیں ہوجائے گا۔ اے نیک خاتون میں تمھیں ہفتے بھر کا وقت دیتا ہوں۔ مگر ایک بات مت بھولنا کہ میرا یہ پیام اچانک ہی میرے دل میں نہیں آیا۔ یہ لڑکی کئی مہینوں سے میری نگاہوں میں تھی اور اب اگر یہ موقع میں ہاتھ سے جانے دوں تو میرا نام جاوید نہیں۔ تم ضرور ٹھنڈے دماغ سے سوچ وچار کرلو۔ مجھے کوئی جلدی نہیں۔''

وہ پھر باہر صحن میں چلا گیا۔

اس صبح جو کچھ بھی ہوا اور اس پر جاوید کے شادی کے پیام کو لے کر میں سارا دن سوچ میں پڑی رہی۔ ہمارا بستر برآمدے میں بچھایا گیا تھا۔ میں سیدھی لیٹی ہوئی چھت پر دو چھپکلیوں کو مکھیوں پر جھپٹتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ امی کوٹھی والی کے ساتھ باتوں میں لگی ہوئی تھیں۔ ان کی شائستہ اردو، نفاست اور اونچے اطلاق نے دم بھر میں کوٹھی والی کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ امی کی باتوں نے اسے مسخر کرلیا تھا اور وہ ہمارے ساتھ پوری ہمدردی کا اظہار کرنے لگی تھی۔ جاوید کے گھر وہ تھوڑی دیر کے لیے آئی تھی مگر اب جانا نہیں چاہتی تھی۔

''مریم کو میرے ساتھ بھیج دو۔ چند دن میرے پاس بھی رہ لے گی۔'' اس نے اپنی

بھتیجی سے کہا۔

''اور اس لڑکی کا کیا ہوگا؟'' خان بیگم نے پوچھا۔ ''کیا اسے یہاں اکیلا چھوڑ جاؤ گی؟''

''قطعی نہیں۔ وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ ہی آئے گی اور ہاں، قابل تم اس کی باتوں سے بالکل پریشان مت ہونا، جاوید آج کل کچھ بدحواس سا ہورہا ہے۔ جلدی ہی ٹھیک ہوجائے گا۔ جہاں تک ان معصوم عورتوں کا سوال ہے، ان کا کوئی قصور نہیں۔ تم میرے ساتھ چلوگی نا مریم۔ کیوں؟''

''ہم تیار ہیں اگر ہمیں یہاں سے جانے دیا جائے تو۔'' امی نے کہا۔

ہم نانی اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے لیے فکر میں ڈوبے ہوئے تھے کہ صدر دروازے پر ہورہی بحث کی آواز ہمارے کانوں میں پڑی۔ یہ آواز ہمارے دوست اور محافظ رام جی لال کی تھی جس نے ہمیں ڈھونڈ نکالا تھا اور ہم سے ملنے کے لیے مصر تھا۔

''خان صاحب'' وہ جاوید سے کہہ رہا تھا۔ ''یہ تمھاری زیادتی تھی کہ تم میری غیر حاضری میں میرے گھر میں گھس کر میری اجازت کے بغیر میرے مہمانوں کو لے آئے۔ اگر میں موجود ہوتا تو یہ حرکت کرنے کے لیے تمھیں میری لاش پر سے گزرنا پڑتا۔''

''اسی لیے تو میں تمھاری غیر حاضری میں گیا تھا کیوں کہ میں تمھاری جان نہیں لینا چاہتا تھا۔ جاوید نے کہا۔

''میں اگر ان کی حفاظت نہ کرتا تو ماتھر نہ کہلاتا۔ خیر اب جو ہوا سو ہوا میں تمھیں ان لوگوں کو واپس اپنے گھر پہنچانے کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔ لیکن مجھے ذرا یہ پتا تو لگانے دو کہ انھیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ میں ان کو الوداع بھی کہنا چاہوں گا۔''

امی دروازے پر گئیں اور خطرہ مول لے کر ہم سے ملنے آنے کے لیے لالا کا شکریہ ادا کیا۔

''بھگوان وشنو کا حکم ٹالا نہیں جاسکتا تھا۔'' لالا نے ہار مانتے ہوئے کہا۔ ''ہماری کیا طاقت تھی کہ ہم اس ہونی کو روک سکیں۔ لیکن اطمینان رکھو اچھے دن بھی آئیں گے۔ میں تمھارے زیورات کا بکسہ تمھیں واپس دینے آیا ہوں۔''

امی نے بکسہ ہاتھ میں لیا اور کھول کر اسے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ انھیں یقین تھا کہ اس میں کوئی بھی چیز غائب نہیں ہوئی ہوگی۔

''وہ سونا جو تم نے مجھے دیا میں نے بیچ دیا تھا۔ لالا نے کہا۔'' ۳۰ روپے ملے تھے اس کے، وہ یہ رہے۔ ننھی اور نانی کو میں شام کے وقت چھوڑ جاؤں گا۔ باقی لوگ کچھ دیر اور میرے ساتھ ٹھہر سکتے ہیں۔''

''ارے لالا! ہم تمھاری ان مہربانیوں کا قرض بھلا کیوں کر اتاریں گے۔'' امی نے کہا۔''انھیں تم اپنے پاس ہی رکھو یا جیسے تم ٹھیک سمجھو ویسے ہی کرو۔ لالا ہمیں تو اپنی دیکھ بھال بھی بھاری پڑ رہی ہے۔''

''اچھی بات ہے۔ میں انھیں اپنے ساتھ بریلی لیے جاتا ہوں اور تمھارے لیے حفاظت سے رکھ چھوڑوں گا۔''

اس نے جھک کر امی کو سلام کیا اور چلا گیا۔ اس کے بعد ہم اس سے نہیں ملے۔

بعد میں ہمیں پتا چلا کہ لالا اپنے بچوں سمیت بریلی چلا گیا تھا اور ہماری پرانی نوکرانی دھانی کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ ہمارے پالتو کتوں کا کیا ہوا، اس کی ہمیں کچھ خبر نہیں۔ اسی شام جاوید خود لالا کے گھر جا کر نانی اور آنیٹ کو لے آیا، جو ہم سے مل کر بے حد خوش ہوئیں۔ مہمان نوازی کے اصول کے مطابق کھانا فوراً اُن کے لیے پروسا گیا۔

آٹھ لوگوں کا ہمارا کنبہ سمٹ کر صرف چار افراد کا رہ گیا تھا۔ پلو، اس کی ماں اور چمپا لالا کے گھر پر رہ گئے تھے اور بہت عرصے تک ہمیں ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ جاوید اپنے گھر میں چودہ برس کے فرنگی لڑکے کو نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ پلو کے لیے بھی یہ خوش قسمتی کی بات تھی کہ وہ نہیں آیا، نہیں تو جاوید کے محلے میں جو سفاک لوگ رہتے تھے ان کے ہاتھوں مارا جاتا۔

پلّو کا حشر

سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ میں گھر کے اُن تین لوگوں، جو لالا

کے یہاں رہ گئے تھے، کے بارے میں کچھ قلم بند کروں۔

جیسے ہی لالا اور جاوید خان نانی اور آنیٹ کو لے کر گھر سے نکلے پٹھانوں کا ایک اور گروہ جن کا سردار منگل خان تھا وہاں پہنچ گیا۔ وہ زبردستی ان کے مکان میں گھس گیا۔ لالا کے گھر کی عورتیں پہلے کی طرح چھت پر چلی گئیں۔ پلّو، اس کی ماں اور ان کی نوکرانی چمپا نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔

''کہاں ہے وہ فرنگی لڑکا؟'' منگل خان نے چلا کر کہا۔''باہر نکالو اسے تاکہ اس کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیا جائے جو اس جیسے دوسرے لوگوں کے ساتھ کیا ہے۔''

یہ دیکھتے ہوئے کہ پلّو کے بچنے کی اب کوئی امید نہیں اس کی ماں منگل خان کے پاؤں پر گر پڑی اور اپنے لڑکے کی زندگی کے لیے بھیک مانگنے لگی۔

''تمھارا لڑکا!'' منگل نے سر سے پاؤں تک اس کی طرف دیکھا کیوں کہ وہ بذاتِ خود کالی تھی، غیر یقینی طور پر اس نے کہا''ہم دیکھیں گے وہ کیسا لگتا ہے؟''

پلّو کائستھوں کے لڑکے کی طرح بڑھیا پینٹ اور قمیص پہنے ہوئے باہر آیا۔ پاؤں میں نہ تو اس نے جرابیں پہنی تھیں نہ ہی جوتے اور نہ ہی سر پر کوئی ٹوپی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ سفید تھا جسے وہ چھپا نہیں سکتا تھا۔

''یہ لڑکا تو میرے کندھوں تک بھی نہیں آتا۔'' منگل نے اس کے ساتھ کھڑے ہو کر کہا۔''کیا عمر ہے تمھاری؟'' منگل نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

پلّو خوف کے مارے سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا وہ کیا جواب دیتا۔ وہ اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی اور بولی''تمھارا یہ غلام چودہ سال سے زیادہ کا نہیں ہے خان صاحب! اللہ کی خاطر اس کی زندگی بخش دو۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے اور وہ ایک بار پھر اس کے پاؤں پر گر پڑی۔

اُس کے بار بار گڑگڑانے سے پٹھان کے جذبات کو ٹھیس لگی اور رحم دلی سے بولا۔

''اُٹھ اے عورت، میری سمجھ میں آ گیا کہ لڑکا ابھی چھوٹا اور کوئی نقصان پہنچانے کے لائق

نہیں۔ کیا تم دونوں میرے ساتھ چلو گے؟ یاد رکھو اگر تم نے نہ کی تو اور لوگ بھی ہیں جو اتنے نرم دل نہیں جتنا میں ہوں۔''

لالا کا مکان چھپنے کے لیے اتنا محفوظ نہیں رہا تھا۔ پلّو کی ماں منگل خان کے ساتھ جانے کے لیے راضی ہوگئی۔ وہ چمپا کو لے کر ایک دوسرے مکان میں آ گئے جہاں پٹھان کثرت میں تھے اور منگل خان کے گھر میں پناہ گزیں ہو گئے۔

منگل خان دل کا بہت نرم اور سخی آدمی تھا، بھگوڑوں کو اپنے گھر لا کر وہ ان کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آیا۔ پلّو کو اس نے غلام حسین کا نام دیا اور اس کی ماں غلام حسین کی ماں کے لقب سے پکاری جانے لگی۔ چمپا کا نام چمپا ہی تھا۔ وہ راجپوت گھرانے سے تھی اس لیے اس کی نسل کو متعین کرنے میں کوئی مغالطہ نہیں ہوسکتا تھا۔ پلّو اور اس کی ماں منگل خان کی حفاظت میں رہنے لگے۔ آگے چل کر ان کے ساتھ کیا ہوا، اس کا لالا رام جی کا گھر چھوڑنے کے کئی ماہ بعد ہمیں پتا چلا۔

خطرے کی گھنٹیاں

یہ ہمارے فائدے کی بات تھی کہ ہم بھول جاتے کہ یورپی خون ہماری رگوں میں دوڑ رہا تھا یا پھر انگریزی حکومت دوبارہ قائم ہونے میں ہی ہماری بہتری تھی۔ ہماری بھلائی کے لیے یہ بھی ضروری لگا کہ ہم حضرت عیسیٰؑ کو بھول جائیں اور یہ یقین دلائیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ کوٹھی والی ہمیں کلمہ پڑھنا سکھاتی تھی لیکن امی کہتی تھیں کہ وہ کلمہ پڑھنا جانتی ہیں اور یہ سچ بھی تھا مگر جب وہ دوسروں کے ساتھ نماز میں شامل ہونے کے لیے کہتیں تو امی بہانہ کر دیتیں کہ ہم نماز کیوں کر پڑھیں؟ ہمارے کپڑے گندے ہیں اور دوسرے کپڑے ہمارے پاس نہیں ہیں۔

ہمارے پاس فقط وہی کپڑے تھے جو ہمیں لالا رام جی لال کے گھر سے ملے تھے۔ جاوید کے یہاں آئے ہوئے ہمیں تیسرا دن تھا کہ اس بات پر اس نے پہلی بار دھیان دیا۔

''مریم!'' وہ بولا، 'میرے گھر میں یہ کپڑے نہیں چلیں گے۔ تم لوگ پاجامہ پہنا کرو۔''

''پاجامہ لانے کے لیے میں پیشہ کہاں سے لاؤں؟'' امی نے کہا۔

اسی روز جاوید بازار سے کالی چھینٹ کا کپڑا لے کر آیا اور امی کو دیا۔ امی نے کپڑے کے پاجامے کرتے اور دوپٹے کاٹے اور میں نے اور آنیٹ نے اس پر سلائی کی۔ خان بیگم یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ امی نے کتنی نفاست سے کپڑے کاٹے تھے اور آنیٹ اور میں سلائی کرنے میں کیسی مہارت رکھتی تھیں۔

نئے کپڑے زیب تن کرنے سے پہلے امی چاہتی تھیں ہم لوگوں کے نہانے کا انتظام بھی کر دیا جائے۔ میرا خیال ہے ہمیں نہائے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تھا کیوں کہ لالا کے گھر میں پانی کہیں نزدیک سے مہیا نہیں ہوسکتا تھا۔ لالا کے گھر کی عورتیں تو ہر صبح دریا میں جا کر نہا لیتی تھیں لیکن ہمارے لیے گھر سے باہر نکلنا خطرہ مول لینا تھا۔

جاوید خان کے گھر کے صحن کے بیچ ایک کنواں تھا، اس لیے ہمارے نہانے کے لیے ٹھنڈا پانی مہیا ہوسکتا تھا۔ امی نے گھر کی نائن زیبان سے ہمارے نہانے کے لیے کنویں سے پانی کھینچنے کے لیے کہا اور یہ بھی کہ وہ نہانے میں ہماری مدد کرے۔ اس کے لیے اسے چار پیسے، یعنی ایک شخص کے لیے پانی کھینچنے کا ایک پیسہ اجرت دے گی۔ نائن اس اجرت کے ملنے کی امید سے بے حد خوش ہوئی۔ اُس نے صحن میں تین چار، چارپائیاں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر کھڑی کیں اور ان پر پردے کے لیے چادریں تان دیں۔ کوٹھی والی کو جب یہ پتا چلا کہ ہم نہا کر نئے کپڑے پہننے والی ہیں تو وہ اس کو ایک تماشا سمجھ کر بڑبڑاتی ہوئی آئی۔ وہ ہمیں غسل کے مذہبی اصولوں سے واقف کرانا چاہتی تھیں۔

۲/جولائی کا دن اصول صحت کے لحاظ سے ہماری زندگی کا بڑا یادگار دن تھا۔ کوٹھی والی خود اپنے ہاتھوں سے ہم پر پانی ڈالنا چاہتی تھی لیکن امی نے سخت اعتراض کیا۔ امی نے سمجھانے کی کوشش کی کہ ہمارے گھر میں کسی کے سامنے چاہے وہ ہم جنس ہی کیوں نہ ہو، کپڑے اتارنے کا رواج نہیں۔ اس لیے کوٹھی والی کو زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔

کوٹھی والی ناامید ہوگئی۔ ''مگر تم یہ متبرک غسل کر کے پاکدامن کیسے بن سکو گی۔ کم سے کم تین لوٹے متبرک پانی کے تو ڈالنے ہی ہوتے ہیں؟'' اس نے کہا۔

جواب امی کے پاس تیار تھا۔ انھوں نے کہا: ''ہم سب کو کلمہ حفظ ہے اور جب آخری تین لوٹے پانی کے ڈالنے رہ جائیں گے تو وہ اس بات کا خیال رکھیں گی۔'' یہ پریشانی تو دور ہوئی۔ ہم لوگوں نے کنوئیں کے تازہ پانی سے اپنے بدن صاف کیے۔ اس کے بعد نئے کپڑے زیب تن کیے جو ہم پر خوب جچے۔

ہم نے سُکھانے کے لیے اپنے بال کھولے تو وہاں موجود عورتیں عش عش کر اُٹھیں۔ ''ہائے! اتنے لمبے خوبصورت بال!'' اور میرے گھنگھرالے بال لمبے تو نہ تھے مگر چھلے دار تھے۔ ان کو دیکھ کر وہ بولیں: ''یہ تو گھنگھر والے ہیں۔'' امی اور نانی کے سر پر بھی اچھے گھنے بال تھے۔ نانی کے بال تو ایڑیوں تک پہنچتے تھے اور امی کے گھٹنوں سے تھوڑا نیچے تک۔ میری طرح آنیٹ کے بال بھی کمر تک ہی تھے لیکن تھے بڑے گھنے اور چوٹی گندھنے پر تو موٹی عورت کے بازو جتنی لگتی تھی۔ ہم بال سکھانے بیٹھیں تو عورتیں منہ کھولے ہمیں گھورتی رہیں۔ ہم نے ان کو بتایا کہ امی جس خاندان سے تعلق رکھتی ہیں وہاں کی عورتوں کے بال بہت لمبے اور گھنے ہوتے ہیں۔ اتنے سارے بالوں کو تیل لگانے کا بھی مسئلہ ہمارے سامنے تھا۔ خان بیگم نے ہم سے پوچھا۔ ''تم بالوں میں کون سا تیل لگاتی ہو؟'' امی نے کہا کہ وہ ناریل کا تیل لگاتی ہیں۔ لیکن ناریل کا اتنا سارا تیل بھلا کہاں سے آئے گا۔ خان بیگم نے زیبان کو ایک پیسہ دے کر بازار سے میٹھا تیل لانے کو کہا۔ سینگ سے بنی بڑھیا دانتوں والی ایک کنگھی بھی منگوائی۔ نانی نے امی کے بالوں کو تیل لگایا اور امی نے میرے اور آنیٹ و نانی کے بالوں کو تیل لگایا۔

اگلی صبح ہم تروتازہ اور خوش محسوس کر رہے تھے۔ ہم ایک اور سوٹ کے سینے میں مصروف ہوگئے۔ اسے ہم اگلے جمعہ کے دن پہننے کی سوچ رہے تھے، کیوں کہ اکثر پٹھان عورتیں جمعہ کے دن ہی نہاتی تھیں۔

دس بجے کے قریب سرفراز خان جو جاوید کی بیوی کا چچا تھا جاوید سے ملنے کے لیے

آیا۔ یہ شخص پولیس کے محکمے میں سپاہی تھا اور غدر شروع ہوتے ہی اپنے گھر واپس آ گیا تھا۔ وقت کے تقاضے کے مطابق وہ ایک تلوار، پستول، چاقو اور دو کالی بندوقوں سے لیس تھا۔ جاوید کو جب وہ دروازے پر ملا تو بڑے جوش میں تھا۔

''تم نے اپنے گھر میں کچھ فرنگی خواتین کو پناہ دی ہوئی ہے جاوید۔ کیا میں انھیں دیکھ سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''تم انھیں دیکھ سکتے ہو۔'' جاوید نے کہا۔ ''اور یقیناً خوبصورتی کے لیے میرے ذوق کی تعریف بھی ضرور کرو گے۔''

پستول پر ہاتھ رکھے اور خوفناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ برآمدے میں آ گیا۔ خان بیگم نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔ ہم بھی سلام کے لیے جھک گئے۔ وہ ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بندوق کا کندہ زمین پر ٹکا لیا اور دوسرے ہاتھ سے نال کو پکڑے رکھا جو پٹھانوں کا خاصہ ہے۔

''تو یہ ہیں وہ فرنگی جنھوں نے سارے محلے میں ہنگامہ کھڑا کر رکھا ہے۔'' وہ بولا۔ جاوید اندر مکان میں چلا گیا تھا۔ امی نے اسے جواب دیا۔

''ہم بھلا کیا ہنگامہ کھڑا کر سکتی ہیں۔ ہم جو بے یار و مددگار ہیں۔''

''پھر بھی ہر ایک کی زبان پر یہ بات ہے کہ تم اس گھر میں اس لیے ٹکی ہوتا کہ تم اپنی بیٹی کے لیے خاوند تلاش کر سکو اور غالباً جاوید اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے! تم نے اس نیک عورت کو کیوں مصیبت میں ڈال دیا ہے۔'' وہ خان بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

امی اس کے الزام سے ناراض ہوئیں لیکن خود پر قابو رکھتے ہوئے حلیمی سے کہا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو بھائی؟ تم شاید جانتے ہوگے کہ ہم اس گھر میں داخل بھی نہ ہوتیں اگر ہمیں یہاں آنے پر مجبور نہ کیا جاتا۔ جاوید خان ہمیں اپنی خوشی سے زبردستی اس گھر سے لے کر آیا ہے جہاں ہم کو ہر سہولت مہیا تھی۔ ہم اس کی مہربانیوں کے لیے شکرگزار ہیں۔ لیکن جہاں تک میری بیٹی کی شادی کا سوال ہے تو چاہے وہ جاوید سے ہو یا کسی اور سے،

اس کے بارے میں ابھی کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ میں تمھارے بھائی کی شکر گزار ہوں کہ اس نے اپنی خواہش کو ہم پر تھوپا نہیں۔''

''پھر بھی سارا محلّہ یہی باتیں کر رہا ہے۔'' سرفراز نے کہا۔ ''یہی کہ جاوید تمھاری بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اس بات نے خان بیگم کو برہم کر دیا ہے۔''

''لوگوں کی زبان کو ہم کیسے روک سکتے ہیں؟'' امی نے کہا ''ہم خان بیگم کو کسی قسم کی پریشانی نہیں ہونے دیں گے۔''

جاوید، جو ساری باتیں سن رہا تھا آگے بڑھا۔ وہ پریشان لگ رہا تھا۔ ''بھائی جان! اس نیک خاتون سے سوال جواب کرنے میں اور ان لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کرنے میں جیسے کہ یہ لوگ گھس بیٹھیے ہیں، تمھارا کیا مقصد ہے۔ میں اپنے سر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ لوگ بالکل بے قصور ہیں۔ ان کو اس گھر میں لانے والا میں ہوں اور میں ہی ان کے لیے جواب دہ ہوں۔''

''لیکن تم نے اپنی نیک بیوی کو مصیبت میں کیوں ڈال دیا ہے؟'' سرفراز نے پوچھا ''تم نے اپنی بے وقوفی سے ہمارے خاندان کا نام بدنام کر دیا ہے۔''

''میں جانتا ہوں تمھیں یہاں کس نے بھیجا ہے۔'' اپنے دونوں بازوؤں کو سینے لگا کر جاوید نے کہا۔

''ہاں عبدالرؤف نے مجھے یہاں بھیجا ہے یہ کہہ کر کہ ان عورتوں کو دریا کے کنارے لے جا کر ان کا سر قلم کر دیا جائے تا کہ تمھاری بیوی کے سینے میں جو آگ سلگ رہی ہے وہ بجھ جائے۔''

''کسی کو مجھ سے یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ میں اپنے گھر میں کیا کروں کیا نہ کروں۔'' جاوید نے سیدھا کھڑا ہو کر اور سرفراز کے قد سے اونچا اُٹھ کر تلخ لہجے میں کہا۔ ''عبدالرؤف اگر اتنا ہی عقلمند ہے تو پہلے اپنے گھر اور بیوی بچوں کا خیال کرے نہ کہ دوسرے کے گھروں میں تاک جھانک کرے۔ مجھے اس کی دخل اندازی قطعی پسند نہیں اور یہ قابل بڑی بے وقوف عورت ہے جو پڑوسیوں سے بڑھ چڑھ کر باتیں کرتی ہے۔ مجھے

اس پر لگام لگانی ہوگی۔''

دونوں پٹھان آپس میں جھگڑ پڑے اور نہ جانے کیا کر بیٹھتے اگر امی ان کے بیچ میں نہ آتیں ''جہاں تک ہمارے سر قلم کرنے کا سوال ہے خان صاحب، تو تلوار تمھارے قبضے میں ہے۔ ہم میں سے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ اللہ کی اگر یہی مرضی ہے کہ ہم تمھارے ہاتھوں مریں تو ایسا ہی سہی۔ لیکن میں تم سے ایک درخواست ضرور کروں گی کہ تم ہم سب کو بلا کسی رو رعایت کے ایک ساتھ قتل کرو گے۔ میں تمھیں ایک یا دو کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔''

امی کے بلند حوصلے اور اللہ کا واسطہ دینے سرفراز نرم پڑ گیا۔ وہ اسی تپاک سے امی کی طرف بڑھا جیسے دوسرے بڑھے تھے۔

''کتنا اعتماد ہے تم میں! کتنا حوصلہ ہے!'' وہ بولا۔ ''میں اس معاملے میں بری الذمہ ہوتا ہوں۔ مجھے دراصل گمراہ کر دیا گیا تھا۔ ایک عورت نے مجھے میرے غلط ارادوں سے بچا لیا!''

''یہی اللہ کی مرضی تھی!'' جاوید نے کہا ''تم دوبارہ یہ بے وقوفی نہیں کرو گے۔ ارے اپنے رشتہ داروں کی خاطر تم اپنے دل کو زہر آلود کیوں کرتے ہو؟ میں خوب جانتا تھا کہ یہ سب ان کی کرنی تھی۔''

ایک اور پیش کش

سرفراز کو آئے ہوئے دو تین دن گزر چکے تھے۔ ہم ایک روز جب رات کا کھانا کھا چکے تو جاوید کمرے میں آ کر آرام سے لکڑی کی پیڑھی پر بیٹھ گیا۔

امی کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''مریم تم نے مجھ سے اس موضوع پر جو مجھے بہت عزیز ہے، بات کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب تک تم نے اس کے بارے میں سوچ وچار کر لیا ہوگا۔ مجھے اب کوئی معقول سا جواب چاہیے۔''

''کس موضوع کی بات کر رہے ہو تم؟'' امی نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''میرا مطلب تمھاری بیٹی سے شادی کی میری پیش کش سے ہے۔''

''میرے پاس اس بارے میں سوچنے کے لیے وقت ہی کہاں تھا۔'' امی نے کہا۔ ''مسئلہ اہم اور غور طلب ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ تمھارا سالا ہمیں قتل کرنے کے ارادہ سے آیا تھا۔ تمھاری حفاظت میں ہوتے ہوئے بھی اگر تلوار ہمارے سر پر لٹکتی رہے تو شادی جیسے مسئلے پر بات کرنا بے سود ہے۔ اگر مجھے مرنا ہی ہے تو میری بیٹی بھی کیسے زندہ رہ سکتی ہے۔ وہ مجھ سے جدا نہیں رہ سکتی، سرفراز جیسا کوئی دوسرا آدمی بھی تو کسی وقت آ سکتا ہے۔''

''قسم میرے سر کی جب تم اس طرح کی باتیں کرتی ہو تو میرا غصہ بڑھ جاتا ہے۔'' جاوید نے کہا۔ ''اگر اس نے تم میں سے کسی کے اوپر ہاتھ اٹھایا ہوتا تو وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ جب تک تم جاوید کی چھت کے نیچے ہو کسی کی کیا مجال کہ وہ تم لوگوں کی طرف انگلی اُٹھا سکے۔ اپنے فرنگی مہمانوں کی حفاظت کی خاطر میں آدھا درجن لوگوں کے سر قلم کر دوں گا۔'' اس نے میری طرف غصے اور خون خوار نظروں سے اس طرح دیکھا کہ میں کانپ اٹھی اور امی کے پیچھے ہو کر اپنا منہ چھپا لیا۔

وہ شدت کی حد تک برانگیختہ تھا اور اسے خاموش کرنے کے لیے امی نے کہا ''مجھے یقین ہے کہ تم ہماری حفاظت کرنے کی پوری طاقت رکھتے ہو۔ لیکن تم بار بار اس پیش کش کو کیوں دہراتے رہتے ہو؟''

''کیوں کہ یہ میرے دماغ میں بری طرح گھسی ہوئی ہے۔ میں اس میں تاخیر نہیں چاہتا۔''

''اگر تم ہمارے حالات اور ہمارے خاندان کی تاریخ سے واقف ہوتے تو تم خود ہی سمجھ جاتے کہ میں اپنی بیٹی کی شادی رچانے کے قابل نہیں ہوں۔'' امی نے کہا۔

''لیکن کیوں؟'' جاوید نے پوچھا۔

''میرے بھائی ابھی زندہ ہیں۔ جب ان کو پتا چلے گا کہ میں نے اپنی بیٹی کی شادی تم سے کر دی ہے جب کہ وہ ابھی بچی ہے تو ان کو کیا جواب دوں گی؟ اس کے علاوہ میرے

خاوند کا چھوٹا بھائی بھی ابھی زندہ ہے۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے ان سے مشورہ لینا ہوگا۔''

''شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔'' جاوید نے کہا۔ ''لیکن تم سے وہ کچھ کہیں گے یہ ناممکن سی بات ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ بھی دوسرے فرنگیوں کے ساتھ مار دیے گئے ہوں۔''

''نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ عقلمندی کی بات تو یہ ہوگی کہ ہم کچھ دیر اور انتظار کریں اور کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے اس بات کی تصدیق کر لیں کہ وہ واقعی مار دیے گئے ہیں۔''

''میں بڑا بے صبرا ہوں مریم اور زندگی اتنی لمبی نہیں کہ میں ابد تک اپنی خواہشوں کے پورا ہونے کا انتظار کروں۔ میں نے تمھارا اور تمھاری خواہشات کا احترام کرتے ہوئے خود کو روکے رکھا ہے۔ لیکن تمھاری بیٹی کو اپنی بیگم بنانے کی خواہش دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے اور میں اسے اپنانے کے لیے کوئی بھی خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوں۔''

''ذرا سوچو اگر انگریز سرکار پھر اقتدار میں آ جاتی ہے، اس صورت میں ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ تمھاری زندگی بے معنی سی ہو جائے گی۔ تم ختم کر دیے جاؤ گے اور میری بیٹی تیرہ برس کی عمر میں بیوہ کہلائے گی۔ کیا تم کچھ مہینے انتظار نہیں کر سکتے؟ جب تک ہم لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ اس ملک پر کون حکومت کرے گا۔''

''اگر انگریزوں کا شاہ جہاں پور پر دوبارہ قبضہ ہو گیا تو وہ باغیوں کے سرداروں سے کوئی رحم دلی نہیں دکھائیں گے۔ یہاں کسی نزدیک درخت سے مجھے پھانسی پر لٹکا دیں گے۔ بلاشک تم ان کی واپسی کی امید باندھے ہوئے ہو ورنہ تم اس قسم کی امکان کی بات کیوں کرتیں۔ اب بھلا کتنے فرنگی باقی بچے ہوں گے؟ فقط چند ہزار جو دلّی کی فصیلوں سے جوجھتے ہوئے بمشکل خود کو بچا رہے ہوں گے اور انشاء اللہ ان کا بھی جلد صفایا کر دیا جائے گا۔''

''تو دہلی کو ہمارے مستقبل کا فیصلہ کر لینے دو۔'' امی نے ہاتھ میں ایک تنکا لیتے ہوئے کہا۔ ''برطانیہ کی فوج جو اب دہلی کا محاصرہ کیے ہوئے ہے، ختم ہو جائے گی تو تمھاری پیش کش پر بات ہو سکتی ہے۔ کیا ابھی ہم تمھارے سہارے نہیں پڑے ہوئے اور

تمھاری طاقت کے زیر اثر نہیں؟ تم ذرا جنگ کے خاتمے کا انتظار کرو۔''

''تم بہت لمبی ہانک رہی ہو مریم، اور شاید یہ بھول رہی ہو کہ میں تمھاری مرضی کے خلاف ہی نہیں بلکہ ہر کسی کی مرضی کے خلاف.....'' اس نے اپنی بیوی کو گستاخانہ نظر سے دیکھا..... ''وہ جو حاسد نظروں سے میری طرف دیکھ رہی ہے تمھاری لڑکی سے شادی کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔''

''میں نے کب کہا کہ تم میں جرأت نہیں ہے؟'' امی نے کہا۔ ''اگر تم اسے زبردستی لے جاؤ گے تو ہم میں اتنی طاقت کہاں کہ ہم تمھیں روک سکیں۔ لیکن یہ فعل تمھارا مردانہ فعل نہیں ہوگا کہ تم بنا باپ کی بیٹی کو اپنی ہوس کا شکار بناؤ۔ اس میں کون سی بڑی بات ہوگی؟ لیکن اگر تم اس وقت تک انتظار کرو جب تک انگریزوں کو دلّی سے کھدیڑ نہیں دیا جاتا تو میری ساری دلیلیں بے کار ثابت ہو جائیں گی۔ تب تک میری بیٹی کی عمر بھی شادی کے لائق ہو جائے گی۔''

''تم بہت خوش قسمت ہو کہ میں ایک مرد ہوں لیکن تمھاری بیٹی کو جاوید کے ہاتھوں سے کوئی نہیں چھین سکتا اور یہ جاوید کی بیوی بن کر رہے گی۔ میں اسے بہت سا مال اسباب دوں گا۔ اور مریم اگر تم میری بات مانو تو تم بھی شادی کر لو اور پھر سے اپنا گھر بسا لو۔ تم ابھی جوان ہو۔''

''میں بھلا کیوں اب شادی کرنے لگی؟''

''تمھیں شادی کر لینی چاہیے۔ اگر تمھیں دوبارہ اپنا گھر چاہیے اور کھانے کے لیے روٹی۔''

''میں کیوں شادی کرنے لگی!'' امی نے پوچھا۔ ''میری ان بچیوں کا کیا ہوگا؟''

''تمھاری بچی تو میری بیوی بن جائے گی۔ جاوید نے خوش ہو کر کہا۔ ''رہی تمھاری بھانجی تو اس کے لیے بھی کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔ وہ بھی کوئی کم خوبصورت نہیں ہے۔ کیوں؟''

شام تک ہم نے کوئی بات نہیں کی۔ جاوید خان حقہ لے کر بیٹھ گیا اور کش پہ کش کھینچنے

لگا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اس نے باقی لوگوں کے دماغ میں کیا ہل چل مچا دی ہے۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ خان بیگم اُترا ہوا چہرہ لیے ادھر اُدھر بھاگ رہی تھی اور مجھے دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھر لیتی تھی۔ امی بھی مجھے اور آنیٹ کو دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھر لیتیں اور میں ان کو پریشان کن نگاہوں سے دیکھ لیتی۔

جیسے ہی ہم اپنے گھر کے حصے میں جانے کے لیے اُٹھے خان بیگم نے امی کا ہاتھ پکڑ لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی ''مریم تم میری ماں ہو۔ تم اس کی اتنی مدد مت کرنا جس سے میری ذات کو اور زیادہ اذیت پہنچے۔ میں پہلے ہی بہت کچھ سہن کر چکی ہوں۔ وعدہ کرو کہ تم اپنی بیٹی کو اس کے ساتھ نہیں بیا ہو گی۔''

امی نے جواب دیا۔ ''بی بی تم نے وہ سب دیکھا اور سنا ہے جو کچھ ہوا ہے۔ ان جیتے جاگتے لوگوں میں میری حالت تو ایک مردے جیسی ہے۔ تم خواہ مخواہ میں پریشان ہو رہی ہو۔ اگر میرے بس میں ہو تو وہ کبھی میری رضامندی حاصل نہیں کر سکے گا۔ سوال تو یہ ہے کہ وہ میری رضامندی ملنے تک انتظار کرے گا؟''

''اللہ تمھارا بھلا کرے گا!'' خان بیگم بولی ''اس گھر میں کم حیثیت رہنے کی نسبت تمھاری بیٹی اچھی زندگی کی مستحق ہے۔ میں تمھاری خواہشات کی تکمیل کے لیے دعا کروں گی۔''

اس رات میں اچھی طرح سے سو نہ سکی۔ پورے چاند کی روشنی سلاخوں والی اونچی کھڑکی میں سے بستر کی پائینتی پر پڑ رہی تھی لیکن سرسام پیدا کرنے والے پنچھی کی آواز مجھے سونے نہیں دے رہی تھی۔ ایک بار میری جو آنکھ کھلی تو سامنے جاوید خان کو دروازے پر کھڑا پایا۔ اس کا چہرہ چاند کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ کافی دیر تک وہ وہیں کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ خوف کے مارے میں نہ تو ہل سکتی تھی اور نہ ہی چلا سکتی تھی۔ پھر وہ مڑا اور وہاں سے چپکے سے چلا گیا۔ ڈر کے مارے کانپتے ہوئے میں نے اپنی بانہیں امی کے گرد حائل کر دیں اور رات بھر ان کے ساتھ چپٹی پڑی رہی۔

نمائش

خان بیگم جب پہلے اپنی نند کے ہاں گئی تھی تو اس سے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ پھر اس سے ملنے آئے گی۔ جمعرات کے روز ایک نوکر اس کے پاس پیغام لے کر آیا۔ ''تمھاری نند نے سلام بھیجا ہے اور پوچھا ہے کہ تم اس سے ملنے کا وعدہ کب پورا کروگی۔''

''میری نند کو میرا سلام کہنا اور بتانا کہ میرا ابھی آنا مشکل ہے۔ ہمارے ہاں کچھ فرنگی خواتین رہنے کے لیے آئی ہوئی ہیں جن کو میرے خاوند نے پناہ دی ہے۔''

بعد میں ایک اور پیغام آیا کہ خان بیگم اپنے مہمانوں کو بھی اپنے ہمراہ لیتی آئے۔ اس کے رشتہ داران کے دیدار کے متلاشی ہیں۔ ہماری میزبان نے اگلی صبح ہم سے اس کے ساتھ اس کی نند کامران کے یہاں جانے کی پیش کش کی۔

ہم چاروں ایک میانے میں بیٹھیں۔ خان بیگم، امی، آنیٹ اور میں۔ نانی پیچھے رہ گئیں۔

میانہ پرانے طرز کی ایک چھوٹی سی پالکی ہوتی ہے۔ زمین پر رکھنے کے لیے اس کے ٹھنٹھ سے بنے چار پائے ہوتے ہیں۔ اس کے فرش پر ٹاٹ بچھا ہوتا ہے اور چھت لال پردے سے ڈھکی ہوتی ہے اور پردہ چاروں طرف لٹکا ہوتا ہے۔ بانس کے دو ڈنڈے دونوں طرف ٹھونسے جاتے ہیں جن کے ذریعے کہار اسے زمین سے اُٹھاتے ہیں۔

پسینے سے تر چار کہار ہمیں کامران کے گھر لے آئے جہاں ہمیں تپاک سے خوش آمدید کہا گیا۔ پہلے تو کامران ہم سے بدظن تھی لیکن سرفراز نے اسے پورے حالات سے آگاہ کر کے شبہ کو ختم کر دیا تھا۔ وہ ہم سے ملاقات کی بے حد مشتاق تھی اور ہمیں روکنے کے لیے اس نے بہت زور دیا۔ آنے والے دنوں میں ہم اس کے گھر میں سجاوٹ کی چیز بن گئے جن کو دیکھنے کے لیے لوگ آتے رہتے تھے۔

سرفراز جاوید کے گھر ہمیں قتل کرنے کی غرض سے آیا تھا لیکن امی کی شخصیت نے اس پر وہ جادو کیا کہ وہ ان کا گرویدہ ہوگیا۔ گھر لوٹ کر اس نے کہا: ''ایسے معصوم لوگوں پر بھلا

کون ہاتھ اُٹھا سکتا ہے؟ ماں تو ایک ڈری ہوئی کبوتری کی طرح ہے اور بیٹی ایک بلبل۔''

کامران کے گھر پر ہمیں دیکھنے کے لیے سرفراز کی بیوی حشمت بھی آئی۔ وہ بھی امی کی گرویدہ ہوگئی۔ ''اور بہنا!'' اُس نے کامران بیگم سے کہا ''میرے خاوند کی رائے ان لوگوں کے بارے میں بالکل صحیح تھی۔ مریم کے ہونٹوں سے شہد کی مکھی کی طرح فقط شہد ہی ٹپکتا ہے۔''

کامران کا ہمدردی بھرا نرم و نازک دل ہماری دکھ بھری کہانی سن کر بے حد متاثر ہوا۔ امی کی باتیں سن کر اس کی بڑی بڑی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک بار تو وہ امی کے کندھے پر اپنا سر رکھ کر سسکیاں لینے لگی۔

کامران پینتیس سال کی تھی۔ چربی اس پر چڑھتی جا رہی تھی، لیکن اس کے نقش و نگار تیکھے اور رنگ صاف تھا۔ کہتے ہیں کہ جب وہ شادی کا جوڑا پہن کر بیٹھی ہوئی تھی تو اس کا باپ اس کے پاس سے گزرا۔ وہ اس کی خوبصورتی سے اس قدر متاثر ہوا کہ کہہ اُٹھا۔ ''کیا ہم ایسی خوبصورت لڑکی کو کسی اپنے کے لیے گھر میں محفوظ نہیں رکھ سکتے تا کہ وہ ہمارے خاندان سے باہر نہ جاتی!''

کامران کا خاوند جو عمر میں اس سے بڑا تھا، بھوپال میں فوجی رسالے میں لیفٹیننٹ تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں اسے اس سے نفرت ہوگئی تھی۔ اسے اس کی حرکتیں پسند نہیں تھیں اور وہ اسے ہاتھ تک لگانے نہیں دیتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی ماں اور دوسری عورتیں یہ سمجھنے لگیں کہ اس پر کسی جن بھوت کا سایہ ہے۔ وہ ان کا یہ بھرم بنائے رکھنے میں مصلحت سمجھتی تھی۔ اس کا خاوند پریشان تھا وہ اپنے رسالے میں واپس چلا گیا لیکن اپنی بیوی کی روپے پیسے سے مدد کرتا رہا۔ آخر کچھ دوستوں کی مہربانی سے دونوں میں سمجھوتہ ہوگیا۔ کامران کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام بدرن رکھا گیا۔

بدرن اپنی ماں سے بالکل مختلف تھی۔ ہم نے جب اسے دیکھا تو وہ سولہ یا سترہ برس کی تھی۔ ماں کی نسبت اس کا رنگ کالا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں وہ تروتازگی نہیں تھی جو اس کی ماں کے چہرے پر تھی لیکن اس کے بائیں گال پر گلابی نشان اُس کے

چہرے کی خوبصورتی کو دوبالا کرتا تھا۔ وہ اپنی ماں کی طرح زندہ دل بھی نہیں تھی اور نہ ہی زیادہ چھان بین کرتی تھی۔ ہماری اس سے بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔

کامران ہماری سلائی کے بارے میں سن چکی تھی۔ وہ اپنی نند کے لڑکے کو ایک تحفہ دینا چاہتی تھی۔ اس نے ہم سے اس کے لیے ایک چھوٹا پاجامہ، کوٹ اور ٹوپی بنانے میں ہماری مدد چاہی۔ امی نے یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی کہ وہ کپڑا کاٹ کر اسے سی بھی دیں گی۔

اس نے بینگنی رنگ کے کپڑے کا کرتا کاٹا جس کا گلا مغلئی انداز کا تھا، یعنی اس کا دہانہ بائیں طرف تھا اور بٹن کندھے پر لگا تھا۔ کرتے کے کنارے پر، بازو اور گلے پر سنہری لیس لگائی۔ گلے پر قوس کی شکل کی سنہری کڑھائی کی۔ پٹی اور کندھے پر چمکیلے ستارے ٹانکے۔ پاجامہ بڑھیا ہری ساٹن کا بنایا اور اس پر بھی سنہری لیس لگائی۔ ٹوپی کوٹ والے کپڑے کی بنائی اور اس پر سامنے کئی آویزے ٹانکے جو پہننے پر ماتھے پر ایک فیتہ سا لگتے تھے۔ یہ تینوں کپڑے کامران کو تقریباً چالیس روپے میں پڑے جو ایک بچے کے جوڑے کے لیے قدرے مہنگے تھے۔

امی اپنے کام سے بے حد خوش تھیں اور جس کسی نے یہ جوڑا دیکھا جھوم اٹھا۔ کامران نے امی کو نئی چوڑیوں کا تحفہ دیا جو شیشے کی تھیں اور ان پر مینا کاری کی ہوئی تھی۔

جلدی ہی ہم کامران کے گھر والوں کی منظورِ نظر بن گئیں۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہم پر مہربانی لٹانے کے لیے تیار تھا۔ پہلے تو وہ یہ سمجھتی تھیں کہ ہم فرنگی ہونے کے ناطے اور یورپی عورتوں کی طرح دروازے اور کھڑکیوں کے پاس ہی بیٹھی رہیں گی تاکہ مرد لوگ ہمیں دیکھ سکیں۔ لیکن جب وہ ہمیں سوئی دھاگہ لیے محنت کرتے ہوئے دیکھتیں اور ہم مردوں کی محفل سے کترا تیں تو وہ بہت حیران ہوئیں۔

''تم تو ہماری جیسی ہی ہو۔'' ایک دن کامران نے امی سے کہا ''میں اپنی نسل کی آدھی درجن عورتوں کے بدلے میں بھی تمھیں نہیں جانے دوں گی۔ تم سے بھلا کون تنگ آجائے گا؟''

زنان خانے میں سیاست کا کوئی دخل نہیں تھا۔ جنگیں اور بہادری کے کارنامے

مردوں کے لیے ہی مخصوص تھے۔ شاید ہی کبھی ملک میں پھیلی افراتفری یا ہماری مصیبتوں کا ذکر چھڑا ہو۔ فقط ایک ہی بار ہماری آسودہ زندگی برہم ہوئی تھی اور وہ بھی عمدہ نامی ایک عورت کی وجہ سے جو شروع ہی سے ہم سے حسد کرتی تھی۔

مجھے نہیں معلوم کہ کامران سے اس کا کیا رشتہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو آپا کہہ کر پکارتی تھیں اور بدرن ان کو خالا کہتی تھی۔ وہ ایک بدباطن جوان عورت تھی۔ منہ پھٹ اور تیز طرار اور غیر ملکیوں سے نفرت کرتی تھی۔ وہ ہمیں اس گھر میں دیکھ کر بڑی ناخوش تھی۔ ہمیشہ گھورتی رہتی تھی اور ہر موقع پر ہمارے بارے میں غلط بیانی کرتی تھی۔

انگریزوں کی ہار کا سن کر عمدہ بے حد خوش ہوئی۔ اسے یقین تھا کہ انگریزی فوج دہلی کی فصیلوں سے پرے بھگا دی جائے گی۔ اکثر وہ عام باتوں کو چھوڑ کر لوگوں کی ذاتیات کی طرف زیادہ توجہ دیتی تھی۔

ایک دفعہ آنیٹ اور میں بدرن کے لیے پاجامہ سی رہے تھے۔ بدرن برآمدے کے کونے میں بیٹھی اپنی خوش خلق خاوند حفیظ اللہ خان کے کانوں میں خرافات بھر رہی تھی جب کہ خان کی نظریں عمدہ پر تھیں۔

اُس نے بات کا رُخ بدل کر انگریزوں کے خلاف نفرت اگلنا شروع کی، یعنی انگریز عورتوں کی مردوں کو رجھانے کی عادت۔

''یہ بدکار عورتیں'' اس نے کہا۔ ''یہ مردوں کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔''

''ہاں چاچی'' برآمدے کے دوسرے کونے سے حفیظ اللہ خان نے کہا اور شاید یہی ان کے لیے صحیح فعل ہے۔ وہ مردوں میں اتنی گھری رہتی ہیں اس لیے ان لوگوں کی ہوس تم لوگوں سے کم ہوتی ہے اور پھر سبھی مرد تمھارے خاوند کی طرح اینچی نہیں ہوتے جن کو گندگی میں لوٹنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہوتا۔''

''ہوسکتا ہے۔'' وہ ترشی سے بولی۔ ''لیکن تمھاری اس بات کا فرنگیوں سے کیا تعلق؟ اس بات سے تم انکار نہیں کر سکتے کہ یہ عورتیں اجنبی مردوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتی، نیم برہنہ ہوتی اور کمر میں بانہیں ڈال کر ناچا کرتی ہیں اور ناچتے ہوئے وہ اندھیرے کونے

میں چلی جاتی ہیں اور اپنے خاوند کو چھوڑ کر دوسروں کے ساتھ بوس و کنار کرتی ہیں!''

فرنگی عورتوں کے اِن طور طریقوں کے اظہار سے بدرن کی چمکدار آنکھیں حیرانی سے چوڑی ہوگئی تھیں۔

''مجھے تو اس کا علم نہیں چاچی۔'' حفیظ اللہ نے کہا ''تمھیں ان سب باتوں کا کہاں سے پتا چلا چاچی؟''

''کہیں سے بھی۔'' وہ بے چینی سے بولی۔ ''لیکن میں نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے اور اس لیے میں یہ کہتی ہوں کہ یہ فرنگی خواتین کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور کھڑی کریں گی۔''

''تم بے ہودہ بات کر رہی ہو چاچی'' حفیظ اللہ نے کہا۔ ''میں قسم کھا کر کہتا ہوں تم بات کرتے وقت بالکل بے پروا ہو جاتی ہو۔ ہمارے مہمانوں کے خلاف تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''جب وہ پہلے پہل جاوید کے گھر میں آئیں تو اڑوس پڑوس کے مردوں میں کافی ہل چل مچی تھی۔''

''ممکن ہے۔'' حفیظ اللہ نے طنزاً کہا۔ ''میرا خیال ہے تمھارا خاوند بھی تو بڑا جوش دکھا رہا تھا۔ پھر کیا ہوا؟''

''تم بڑے احمق ہو حفیظ اللہ۔'' اس نے شرارت سے کہا اور ہم سب کے سامنے اس کو آنکھ مارتے ہوئے کہا ''تمھارے اپنے ارادے کیا ہیں۔ بتاؤ؟''

''آج تم بہت واہیات باتیں کر رہی ہو چاچی۔'' حفیظ اللہ نے ذرا بگڑ کر کہا۔ ''تمھاری اس کھوپڑی میں در پردہ کون سی بات ہے، بتاؤ؟ میں تم سے پھر کہتا ہوں کہ مریم اور اس کی بیٹی کے بارے میں جو کچھ کہو سوچ سمجھ کر کہنا!''

''یہ لڑکا تو ان سفید پوٹیوں کا بڑا حمایتی ٹھہرا! لیکن ان کو دیکھ کر مجھے بہت کوفت ہوتی ہے؟''

بحث کچھ تھم گئی تھی۔ امی، آنیٹ اور میں اس بات چیت کے دوران خاموش ہی رہے۔ ہم اپنے حق میں کچھ کہنے کی حالت میں نہیں تھے۔ ہم کامران کی مروت پر تھے اور

ہمارا کسی سے جھگڑا کرنے کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ ہم حفیظ اللہ کی حمایت میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔

عمدہ شرارت پر تلی ہوئی تھی اور موضوع بدلنا نہیں چاہتی تھی۔

''میرا بیٹا بھی مہم میں شامل ہو گیا ہے۔ میں ڈرتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ وہ کوئی فرنگی عورت گھر پر نہ لے آئے۔''

حفیظ اللہ جواب دینے کے لیے تیار تھا۔ ''بلاشک تمھارا بیٹا اس مہم میں بہادری کے بڑے کارنامے دکھائے گا۔ لیکن چوں کہ اسے چند باغی زمین داروں کو کچلنے کے لیے بھیجا گیا ہے، اس لیے میرے خیال میں کوئی فرنگن اس کے ہاتھ نہیں لگنے والی۔''

اس سے پہلے کہ عمدہ کچھ کہتی حفیظ اللہ کھڑا ہو گیا اور اسے اپنے گھر جانے کے لیے کہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے سامنے ہمیں کوئی برا بھلا کہے۔ لیکن عمدہ اپنی بات کہے بغیر نہیں رہ سکی۔

''دعا میں بہت طاقت ہوتی ہے۔'' اس نے کہا ''میں نے خان بیگم سے کہا ہے کہ ہاتھ میں راکھ لے کر ان عورتوں کی طرف اڑا دے تا کہ یہ لوگ راکھ کی طرح اڑ جائیں۔'' اس نے چٹکی بھر مٹی ہماری طرف پھینکی اور منہ ہی میں کچھ بڑبڑائی۔

حفیظ اللہ سے یہ برداشت نہیں ہوا۔ اس نے عمدہ کو پکڑ کر برآمدے سے باہر کر دیا اور چلے جانے کو کہا نہیں تو وہ بری طرح سے اس سے پیش آئے گا۔ لوٹ کر وہ اپنی بیوی کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے غصہ ٹپک رہا تھا۔

برسات

کامران گھر لوٹی اور اسے عمدہ اور اس کے داماد کے بیچ ہونے والے جھگڑے کا پتا چلا تو کہنے لگی۔ ''میرے لیے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ عمدہ کی زبان تو بہت لمبی اور زہریلی ہے۔ تم لوگ میری مہمان ہو تو اس کی چھاتی پر کیوں سانپ لوٹتا ہے؟ اسے تمھارے صبر و تحمل سے کچھ سیکھنا چاہیے تھا۔'' پھر حفیظ اللہ سے بولی ''تمھیں اسے گھر سے

باہر نہیں نکالنا تھا۔ لیکن تم نے ان مصیبت زدہ عورتوں کا ساتھ دے کر ٹھیک کام کیا۔ مریم اس نامعقول کو تم معاف کر دو۔ وہ ایسا نہ کرتی تو یہ نوجوان اس پر کیوں برستا۔ میرا گھر تمھارے لیے ہمیشہ کھلا ہے۔''

برسات اپنے جوبن پر تھی۔ گھنے بادل مغربی آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ ہوا کا جھونکا برسات کی آمد کی خوشبو بکھیر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے صحن میں آگے یاسمین کے پودوں پر ٹپ ٹپ بوندیں پڑنے لگیں۔

شمالی ہندوستان میں عورتیں کے لیے یہ تیوہار کا دن تھا۔ رنگ برنگی پوشاکیں پہن کر عورتیں جھولا جھول کر اپنی خوشی اور لاابالی پن کا اظہار کرتی ہیں۔ درختوں پر دو رسیاں ڈال کر اُن پر خوبصورت رنگوں میں رنگے ہوئے لڑکی کے تختے لگاتی ہیں۔ دو عورتیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ رسّی کو پکڑ لیتی ہیں اور پاؤں نیچے ٹکا لیتی ہیں۔ پہلے وہ آہستہ آہستہ جھولتی ہیں، پھر رفتار بڑھاتی ہیں اور جھولے کو اونچائی پر لے جاتی ہیں اور جھولتے جھولتے ہرے بھرے درختوں اور بھورے آسمان میں دھندلا جاتی ہیں۔ کبھی کبھی رسیوں کے بیچ ایک چھوٹا سا بستر لگا دیا جاتا ہے جس پر دو یا تین لڑکیاں بیٹھ جاتی ہیں جب کہ اور لڑکیاں گاتے ہوئے جھولے کو زور سے دھکا دیتی رہتی ہیں۔

گھر کے پچھواڑے برگد کے درخت پر ایک جھولا ڈالا گیا تھا۔ بدرن اور حشمت سر سے پاؤں تک لال جوڑے پہنے اس پر چڑھ گئیں۔ آنیٹ اور میں ان کو جھولا جھلا رہے تھے اور گلا بیا نوکرانی گا رہی تھی۔ جب وہ جھولے سے اتریں تو ہم نے باری لی۔ ہوا میں اڑنا، بادلوں کو اپنے اوپر اڑتے اور آنیٹ کے کالے بالوں کو اپنے اوپر گرتے دیکھ مجھے بہت فرحت بخش لگا۔ تھوڑی دیر کے لیے زندگی مجھے شاد ماں اور حیرت انگیز لگی۔

امی کو بہت سی لوک کتھائیں یاد تھیں اور وہ اکثر جن بھوتوں اور پریوں کی کہانیاں سنا کر اپنے میزبانوں کو حیران کر دیتی تھیں۔ ایک دن بدرن نہا کر کھلے بالوں کے ساتھ صحن میں آ گئی۔

''میری بچی'' میں نے کہا ''بالوں کو کھلا مت رکھا کرو۔ بالوں کو ہمیشہ گانٹھ دیا کرو۔''

''ابھی میں نے سر پر تیل نہیں لگایا۔'' بدرن نے کہا ''اس لیے بالوں کو کیسے باندھ سکتی ہوں۔''

''شام کے وقت ٹھنڈی ہوا میں بالوں کو کھلا رکھنا اچھا نہیں ہوتا۔''

''بھلا کیوں؟'' بدرن نے پوچھا ''جیسا تم کہتی ہو ویسا ہی کروں گی۔ بالوں کو گانٹھ لگا دوں گی۔'' اس نے امی کو یہ بتانے پر مجبور کر دیا کہ شام کے وقت بالوں کو کھلا چھوڑنا اچھا کیوں نہیں ہوتا۔

''ہوا میں جن منڈلاتے رہتے ہیں جو لمبے بالوں اور تمھاری جیسی بڑی آنکھوں والی لڑکیوں کو پکڑ لیتے ہیں۔ امی نے کہا۔

بدرن اپنی ماں اور خاوند کے سامنے شرما گئی۔ کامران نے اپنی جوانی کے لاابالی پن کو یاد کر کے سب کو بتایا کہ ایک جن اس پر کیسے مرمٹا تھا اور وہ مسکرا دی۔

''جن کیا انسانوں کے پاس آ جاتے ہیں؟'' حفیظ اللہ خان نے پوچھا۔

''لوگ تو ایسا ہی کہتے ہیں۔'' امی نے کہا ''گو میں نے کبھی کسی جن کو دیکھا نہیں۔ لیکن میں نے لوگوں پر ان کا اثر ضرور دیکھا ہے۔''

''بتاؤ تو سہی تم نے کیا دیکھا۔'' کامران جاننے کے لیے بے تاب تھی۔

''ایک خوبصورت لڑکی تھی جس کے بال گھنے اور کالے تھے۔'' امی نے کہنا شروع کیا۔ ''اچانک وہ بہت بیمار پڑ گئی۔ بڑھیا سے بڑھیا علاج کرانے کے باوجود بھی اس کی حالت بدتر ہوتی گئی۔ وہ کوڑے والے کھمبے کی طرح دبلی پتلی ہو گئی۔ اس کی ساری خوبصورتی جاتی رہی سوائے اس کے بالوں کے جو مرتے دن تک خوبصورت اور ملائم بنے رہے۔ جیسے ہی اسے نیند آتی خواب اسے پریشان کرنے لگتے۔ ایک جوان جن خواب میں آتا اور اس سے کہتا کہ ایک شام کو جب وہ تنہا نہا کر اپنے بالوں کو سکھا رہی تھی تو وہ اس کے خوبصورت بالوں پر عاشق ہو گیا تھا اور اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ وہ شدید درد میں مبتلا ہو گئی تھی اور اس کی اس مصیبت کے دوران بھی دکھائی نہ دینے والے جن نے اُس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی اور اس کی آنکھوں کی روشنی میں ہیبت دکھائی

دینے لگی اور جب جسم مرجھا گیا تو وہ لڑکی مرگئی۔ لیکن اس کا شاندار سر پہلے کی طرح خوبصورت رہا۔''

''بڑی بھیانک کہانی ہے!'' بدرن نے اپنے بالوں کو باندھتے ہوئے کہا۔

بات مختلف بھوتوں اور روحوں کی کہانیوں کے سننے سنانے میں چلتی رہی۔ کامران نے ہمیں منجیا.....ایک نوجوان برہمن کی خیالی کہانی سنائی جو شادی سے پہلے مرگیا تھا اور پیپل کے درخت پر اپنا ڈیرہ جمائے ہوئے تھا۔ منجیا جب ناراض ہوتا ہے تو آج بھی وہ درخت سے نیچے اتر کر بیل گاڑیوں، میانوں یہاں تک کہ گھوڑا گاڑیوں کو الٹ دیتا ہے۔ رات کے وقت اگر کوئی پیپل کے درخت کے پاس سے اکیلے گزرتا ہے اور جمائی لیتا ہے تو اسے اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھ لینا چاہیے۔

''اگر تم ایسا نہیں کروگے تو منجیا تمھارا گلا دبا کر تمھیں ختم کردے گا۔'' کامران بولی۔

اس پر امی نے کئی طرح کے بھوتوں کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ بدکار عورتوں کے بھوت یعنی چڑیلیں جو برہنہ ہوتی ہیں اور ان کے پاؤں پیچھے کو مڑے ہوتے ہیں۔ بھوت جن کے آگے کے دانت لمبے ہوتے ہیں اور وہ انسان کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں اور وہ بھوت جو جانوروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ رامپور میں کئی گاؤں ایسے ہیں۔ (امی کے مطابق) جہاں لوگ ایک ایسے علم سے واقف ہیں جس کے ذریعے وہ بتا سکتے ہیں کہ مردے نے اگلے جنم میں کیا شکل اختیار کی ہے۔ چتا کی راکھ کو ایک برتن میں ڈال کر رات کو باہر رکھ دیا جاتا ہے اور اس کو ڈھک دیا جاتا ہے۔ اگلی صبح اس راکھ میں پاؤں کے نشان دیکھے جاسکتے ہیں جو کسی آدمی کے، پنچھی کے یا ہاتھی کے پاؤں کے ہوسکتے ہیں، یعنی جس کی شکل اس نے اختیار کی ہے۔

دس بج چکے تھے اور ہم برآمدے میں بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے۔ امی اور کامران کے ان بدروحوں کو بھگانے کے لیے جادوئی منتر پڑھنے پر بھی ہمارا خوف دور نہیں ہوا تھا۔ میں جب سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو کروٹیں بدلتی ہی رہی اور دیواروں پر ہلتے ہوئے سایوں کو دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر

دستک ہوئی اور حشمت کی آوازیں ہمارے کانوں پر پڑیں۔ اُٹھ کر دروازہ کھولا تو وہ دونوں خوف زدہ اور زرد ہو رہی تھیں۔ کامران ان کو بھی ڈرانے میں کامیاب ہوئی تھی۔

''تم ٹھیک ہو نا خورشید۔'' انھوں نے پوچھا۔ ''تم ہمارے کمرے میں سونا پسند کروگی؟ وہاں محفوظ رہوگی۔ آؤ ہم تمھارا بستر ادھر لے چلتے ہیں۔''

''ہم یہیں ٹھیک ہیں۔'' امی نے احتجاج کیا۔ ''لیکن ہمیں دوسرے کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بھوتوں کا گروہ ہمارے خلاف کوئی سازش کر رہا ہے۔ خان بیگم کہانیاں سننے کے وقت گو موجود تھی لیکن اس موقع پر غائب تھی اور سب سے پہلے وہی چلائی۔ ہم آواز سن کر اس کی طرف لپکے کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ہمارے کمرے سے باہر آرہی ہے۔

''مریم غائب ہوگئی!'' وہ چلائی ''خورشید اور آنیٹ بھی نہیں ہیں۔''

اور جب اس نے ہمیں اپنے کمرے سے نکلتے اور بکھرے بالوں کے ساتھ باہر آتے دیکھا تو وہ زور سے چلائی اور وہیں برآمدے میں بے ہوش ہوکر گر پڑی۔

سفید کبوتر

''تم اپنی پریشانیوں کو بڑی خوبی سے جھیل رہی ہو۔'' ایک دن شام کو حفیظ اللہ نے امی سے کہا۔ ''تم تو بہت خوش باش، صبر والی اور مستقبل کے لیے پرامید ہو۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ اس ماضی کا رونا رونے سے کیا فائدہ جو لوٹ کر نہیں آئے گا۔''

''مجھے تو ان کی حالت سدھرنے میں کوئی امکان نظر نہیں آتا۔'' خان بیگم بولی۔ ''کل ہی وہ فقیر کہہ رہا تھا کہ فرنگیوں کا اس سرزمین سے صفایا کر دیا گیا ہے۔''

''مجھے قطعی یقین نہیں ہو رہا۔'' حفیظ اللہ نے کہا۔

''مجھے بھی نہیں۔'' کامران بولی ''حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے پاس صحیح خبریں بھی تو نہیں آرہی ہیں۔''

''خبر میں تمھیں بتاتا ہوں۔'' حفیظ اللہ نے کہا ''میرے چچا اگرچہ اُس دن کہہ رہے

تھے کہ اب یہاں کوئی فرنگی نہیں ہے لیکن میں نے انھیں سرفراز سے رازدارانہ طور پر کہتے ہوئے سنا تھا کہ اُن کا پوری طرح سے صفایا نہیں ہوا ہے۔ پہاڑ ابھی تک فرنگیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ میرے چچا کہہ رہے تھے کہ عید کے روز عبدالرؤف خان میاں صاحب کے پاس خراجِ تحسین دینے گیا تو وہ اسی فقیر جس کا ذکر تم ابھی کر رہے تھے کی بات سن کر بڑا حیران ہوا۔

''کیا کہا تھا اس نے؟'' خان بیگم نے پوچھا۔

عبدالرؤف نے بتایا: ''میاں صاحب کا مزاج کچھ عجیب سا تھا۔ انھوں نے وہ سفید پوشاک اتار پھینکی جو وہ تین مہینوں سے پہنے ہوئے تھے اور بلا کسی وجہ کے ایک کالا چغا پہن لیا۔ عبدالرؤف دوسرے لوگوں کے ساتھ اُن کے پاس اس لیے گیا تھا کہ وہ یہ دعا کریں کہ فرنگی دہلی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں، جانتے ہو انھوں نے کیا کہا؟''

حفیظ اللہ ڈرامائی انداز میں تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا اور کامران اور خان بیگم نے پوچھا۔ ''تو انھوں نے کیا کہا؟''

''انھوں نے کہا کہ ''فرنگیوں کی حکومت کا پھر سے قائم ہونا اتنا ہی یقینی ہے جتنا روزِ ازل کا آنا۔ غیر ملکیوں کو نکالنے کے لیے سو سال لگیں گے۔ دیکھو وہ آ رہے ہیں! وہ چلایا اور شمال کی جانب اشارہ کیا جہاں سفید کبوتروں کا جھنڈ شہر کے اوپر چکر لگا رہا تھا۔ وہ ان سفید کبوتروں کی طرح آتے ہیں، جو مصیبت کے وقت اڑ جاتے ہیں اور آسمانوں کا چکر لگاتے ہیں اور پھر آرام کرنے کے لیے آ جاتے ہیں۔ سفید کبوتر جو پہاڑوں سے اترتے ہیں!'' عبدالرؤف ہاتھ باندھ کر میاں صاحب کے سامنے کھڑا ہو گیا اور میاں صاحب کو مزید کچھ اور کہنے سے منع کیا۔ لیکن میاں صاحب کسی کی پرواہ نہیں کرتے اور ان کی بات کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔''

کامران کے یہاں ہمارا قیام ختم ہونے کو تھا۔ ہم لگ بھگ برسات کے موسم میں انھیں مہربانوں کے بیچ رہے اور وقت کیسے بیت گیا پتا ہی نہیں چلا۔ کامران اور اس کے داماد حفیظ اللہ نے جو ہمدردی ہم لوگوں پوچھ اور کی اس سے زیادہ کی امید اور کہیں نہیں کی

جا سکتی تھی۔ جاوید خان کئی بار ہم سے ملنے آیا۔ ہم سے ہی کیوں بلکہ اپنی بہن سے بھی۔ ایک دو بار اس نے کامران سے کہا بھی کہ وہ ہمیں جلد ہی واپس بھیج دے لیکن وہ ہمیں بھیجنے پر راضی نہیں ہوئی اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ہم لوگ اس کے لیے کچھ سلائی کرنے میں مصروف ہیں اور کام ابھی باقی ہے۔ جاوید نے زیادہ زور بھی نہیں دیا کیوں کہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ اس کی بیوی اور ہمارے ایک جگہ رہنے سے اس کی مشکلات بڑھ جائیں گی۔

نواب کے ملٹری کمان سونپنے کے بعد سے ہم نے نہیں سنا کہ جاوید نے کوئی نیا معرکہ سر کیا ہو سوائے روز آرم فیکٹری کو بند کروانے کے۔ اس میں بھی اس کا فقط اپنا ذاتی مفاد تھا۔ محمدی میں شاہ جہاں پورے بھاگ کر آئے یورپی سپاہیوں کے قتل عام میں بھی اس نے کوئی خاص جوش نہیں دکھایا تھا۔ اب اس کا کام صرف نواب کی محفلوں کو سجانے یا پھر دہلی سے ملی خبروں، ہمارے جیسے اکا دکا پناہ گزینوں کا اتا پتا بتانے تک ہی محدود تھا۔ مثال کے طور پر ہمیں ریڈ مین گھرانے کے خفیہ ٹھکانے کا پتا چلا، ریڈ مین کی پرانی دھوبن کے گھر کے سامنے سے ایک بھکارن گزر رہی تھی کہ بھیک مانگتے ہوئے اس کی نظر احاطے میں بیٹھی ہوئی ایک لمبی خوبصورت عورت پر پڑی اور وہ اسے پہچان گئی۔

''کون ہو تم؟'' اس نے کھی کھی کر کے پوچھا۔ ''مجھے معلوم ہے تم کون ہو۔ تمھارا وہ سفید فام خاوند اور بیٹا کہاں ہیں؟''

''دفع ہو جا یہاں سے چڑیل!'' ریڈ مین کی بیوی نے ڈانٹا۔ ''جاؤ اور جا کر بھیک مانگو اور ہمارے معاملے میں دخل مت دو۔''

اتنے میں دھوبی گھر پر آ گیا اور حالات کا جائزہ لیتے ہوئے بھکارن سے بولا ''تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ فرنگن ہے؟ یہ تو میری بھابھی ہے؟''

''تمھارے لوگوں کی ذات میں اتنی خوبصورت عورت نہیں ہوتی!'' بڑھیا بھکارن نے مکاری سے کہا۔

''اگر تم نے کچھ اور کہا تو میرا یہ کھڑے دھونے والا تختہ تمھارے سر پر پڑے گا۔'' دھوبی نے اسے دھمکایا۔ ''چل یہاں سے مردار۔''

بھکارن لنگڑاتی ہوئی دھوبی اور ریڈ مین کے گھر والوں کو بددعا دیتی ہوئی سیدھی عبدالرؤف خان کے گھر پہنچی اور اسے پورا قصہ سنایا۔ عبدالرؤف نے یہ خبر جا کر نواب کو دی اور فرنگن کو پکڑنے کے لیے حکم جاری کرنے کا مشورہ دیا۔

''یہ مہم تو تمھاری شایانِ شان ہوگی۔'' نواب نے اس کا دل بہلانے کے لیے کہا۔ ''فرنگن کو پکڑنے کے لیے تمھیں ہتھیار بند کمک کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن میں ان مہاجرین کا پیچھا کرنے کے حق میں نہیں۔ خان صاحب انھوں نے ہمارے مقصد میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی ہے۔'' اس نے انھیں برداشت کرنے کی وہی تلقین کی جیسی کہ ہمارے لیے کی تھی۔

محرم آ کر چلا گیا۔ ہمیں اس کا پتا نہیں چلا کیوں کہ شاہ جہاں پور میں زیادہ شیعہ لوگ نہیں تھے اور تہوار اتنے جوش و خروش سے نہیں منایا گیا تھا جتنا دوسرے شہروں میں منایا جاتا تھا۔ روزوں کے ان دس دنوں میں پٹھان عورتیں شیعہ عورتوں کی طرح ماتم نہیں کرتیں یہاں تک کہ اپنے زیور تک نہیں اتارتیں۔ شہر کے غرباء میں بانٹنے کے لیے کھانا اور کپڑے وغیرہ البتہ مسجدوں میں بھیجے جاتے ہیں۔

محرم کے ختم ہونے پر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم چار ستمبر جمعہ کے روز جاوید کے گھر چلے جائیں گے۔

جاوید خان کی بے تابی

ہم سے کس طرح کا سروکار رکھنے سے پہلے بچاری خان بیگم کو ابھی حسد کی آگ میں جلنا ہی تھا۔ جس دن ہم اس کے گھر پہنچے موقعہ پا کر جاوید نے امی سے پھر میری شادی کی بات چھیڑ دی۔

''مجھے کتنا اور انتظار کرنا پڑے گا مریم؟'' اس نے کھانا کھانے کے بعد پوچھا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں؟'' امی نے آہ بھر کر کہا۔ ''تم مجھ سے کئی بار پوچھ چکے ہو اور میں تم سے پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میں اپنی بیٹی کی شادی اپنے بھائیوں سے پوچھے بغیر

نہیں کر سکتی اور تم اس وقت تک انتظار کرنے کے لیے مان بھی گئے تھے جب تک دہلی کی لڑائی کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔''

''میں تو کہتا ہوں ان فرنگیوں کا نام و نشان ہی مٹ جائے۔'' اس نے غضبناک ہو کر کہا۔ ''مجھے یقین ہے اب تک تمھارے بھائی سب ختم ہو چکے ہوں گے!'' پھر اچانک اس کا مزاج غصے سے افسردگی میں بدل گیا اور وہ خود ہی خود بڑبڑانے لگا ''شاید اس نے سچ ہی کہا تھا۔ ''صوبے دار جی تم کیا سوچتے ہو تم دلّی پہنچ جاؤ گے؟'' گھنشیام کی قسمت میں دہلی کی فصیل کو پار کرنا نہیں لکھا تھا۔ فرنگیوں نے جب بریلی کی فوج پر حملہ کیا تو وہ ہنڈن پل پر ہی گر پڑا تھا۔ وہ بادشاہ کو ۳۱ مئی کو ہوئی ہماری کامیابیوں کی خبر بھی نہیں دے سکا۔ میں نے جو کرنا تھا کیا..... اور محرم کے وقت میٹھی روٹی نے شربت کا کام کیا۔ منگل خان کے ہاں میں نے اس لڑکے کو ختم کر دیا ہوتا مگر وہ بے وقوف منگل بیچ میں آ گیا اور کہا کہ اس نے اس لڑکے کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ ایک مومن کا کسی کافر کو اپنانے کے بارے میں تو میں نے کبھی سنا ہی نہیں تھا..... لعنت ہے ان سب پر!''

اس کا چہرہ کالا پڑ گیا تھا اور ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ جب وہ گھر سے باہر گیا تو چند لمحوں کے بعد سیف اللہ کی چیخوں نے ہمیں دہلا دیا۔ سیف اللہ جاوید کا سوتیلا بھائی تھا جو گلی میں اس کے سامنے آ گیا تھا اور پٹھان اس پر اپنی ناکامی کا غصہ اتار رہا تھا۔

جاوید خان نے لڑکے کے کپڑے اتار دیے تھے اور گھوڑے والی چابک اتنی بری طرح اس پر برسائی تھی کہ اس کی پیٹھ سے چمڑی الگ ہو گئی تھی۔ سیف اللہ کئی دنوں تک زخموں کے درد کی وجہ سے بستر پر پڑا رہا۔ جاوید خان اس پر رحم کرنے کے بجائے اسے دھمکاتا رہا کہ اگر وہ کراہنا بند نہیں کرے گا تو وہ پھر چابک برسائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ امی کے ناامید کر دینے والے جواب نے جاوید کے غصے کو بھڑکا دیا تھا اور میں سوچتی ہوں کہ یہ اچھا ہی ہوا کہ اس کا غصہ اپنے بھائی پر اترا۔ جاوید اس سے اپنے باپ کی ناجائز اولاد ہونے کی وجہ سے بھی نفرت کرتا تھا۔

اسی شام جاوید نے اپنی سفاکانہ حرکت کا ایک اور نمونہ پیش کیا۔ وہ سائس سے پوچھ

رہا تھا گھوڑے کو دانہ دیا یا نہیں۔ سائس نے اسے جب بتایا کہ نوکرانی روپیا نے دانہ پیسا نہیں تو جاوید نے روپیا کو طلب کیا اور پوچھا کہ دانہ کیوں نہیں پیسا۔

''میں دوسرے کاموں میں مصروف تھی۔'' وہ بولی۔

''سچ کہتی ہے مردار؟'' وہ زور سے چلایا اور پھر اپنی چابک ہاتھ میں لے کر اس پر برسانے لگا کہ اس کے جسم پر سیاہ اور نیلے نشان پڑ گئے اور اس کے پھٹے پرانے کپڑوں کے چیتھڑے اڑ گئے۔ وہ بچاری کئی دنوں تک بستر پر پڑی رہی۔ گھر میں ہر کوئی ڈر رہا تھا کہ جاوید کا اگلا نشانہ کون ہوگا۔ امی سے عورت اور لڑکے کا کراہنا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے زیبان سے پسی ہوئی ہلدی منگوائی اور آگ پر گرم کر کے اُن کے زخموں پر اس کا لیپ کیا۔ تین دن تک اس کی تیمارداری کرتی رہیں اور ان کے زخم ہرے ہونے لگے۔

ایک دن جاوید پھر امی کے پاس آیا۔ ہم ڈر رہے تھے کہ وہ پھر اپنے غصے کا اظہار کرے گا لیکن وہ دل شکستہ نظر آیا۔ وہ اپنے کیے پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اپنے سارے جسم میں درد کی شکایت کی اور امی سے اس کا کوئی علاج پوچھا۔

''تم ان دونوں بدبختوں کا علاج کر رہی ہو۔'' اس نے کہا۔ ''میرے لیے بھی کوئی دوا ہے کہ نہیں؟''

''میں تمھیں کیا دوا دے سکتی ہوں؟'' امی نے کہا ''میں کوئی حکیم تو نہیں۔ اگر میں اپنے ہوش میں ہوتی تو تمھارے درد کے بارے میں کوئی علاج ضرور بتاتی۔ لیکن تم بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہے ہو۔''

''نہیں میں ٹھیک نہیں ہوں۔'' جاوید بولا ''میں اپنے گھوڑے پر پہلے کی طرح نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اپنے سے بہتر لوگوں کی بات کی پرواہ نہیں کی کہ جمعرات روز شکار مت کیا کرو۔ پچھلے جمعرات کو جب میں شکار کے لیے گیا تو مجھے ایک کالا ہرن دکھائی دے گیا اور میں نے اس پر گولی چلا دی لیکن نشانہ چوک گیا۔ گولی قبر پر بیٹھے ہوئے ایک سفید کبوتر کو لگی۔ کبوتر اڑ کر ایک جھاڑی میں جا گرا مگر میں اسے ڈھونڈ نہیں پایا۔ ظاہر ہے وہ مر گیا ہوگا۔ اس ن شکار میں مجھے کچھ نہیں ملا اور جب میں شام کے وقت گھر لوٹا تو

مجھے بے حد تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ میں اپنے ہاتھ پاؤں تک نہیں ہلا سکتا تھا۔ میں ایک لاش کی طرح اکڑ گیا تھا۔ میں نے عبدالرؤف کو خبر بھیجی اور جب اسے قصے کا پتا چلا تو وہ مجھ سے ملنے آیا۔ وہ بہت ناراض ہوا کہ میں نے کبوتر پر گولی چلائی۔ ''کبوتر انسان ہوتے ہیں جو جمعرات کے دن اپنی قبروں سے نکل کر ہوا خوری کے لیے آتے ہیں۔'' اس نے بتایا تھا۔ خیر عبدالرؤف نے میرا علاج کیا۔ اس نے مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ آخر میں ہوش میں آ گیا۔ لیکن میرا چہرہ سوجا ہوا ہے جہاں مرحوم نے مجھے ضرور تھپڑ مارا ہوگا۔''

اس کے چہرے پر ہلکی سی سوجن تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ امی اسے اچھی طرح سے دیکھ سکتیں وہ گلی کی جانب سے آ رہی سنگیت کی آواز سن کر چلا گیا۔ اس کے چہرے پر تشدد کی علامت تھی اور وہ اپنی چابک اٹھا کر وہ باہر چلا گیا تھا۔

باہر ماحول ہنگامہ خیز تھا۔ کسی کے چلانے کی آواز ہمارے کانوں میں پڑی ''ہائے! ہائے! مجھے بچاؤ۔ میں مارا جاؤں گا۔''

ہم حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے کہ خان بیگم نے کہا ''یہ وہی لڑکا ہوگا جو کبھی کبھی ادھر سے بانسری پر محبت بھرے گیت گاتا ہوا گزرا کرتا ہے۔ میرے خاوند نے اپنے مرحوم باپ کی قسم کھائی تھی کہ اگر یہ لڑکا کبھی اس کے گھر کے سامنے گاتا ہوا دکھائی دے گیا تو وہ چابک مار مار کر اس کی چمڑی ادھیڑ دے گا۔''

''مگر اس کے گانے سے کسی کا کیا بگڑ جاتا ہے؟'' امی نے پوچھا۔

''میرے خیال میں تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن پٹھانوں کے علاقے میں کسی گلی کوچے میں گانے یا ساز بجانے کی اجازت نہیں۔ ساز ہر طرح کے جذبات کو ابھارتا ہے۔ اسی لیے اسے ناپسند کیا جاتا ہے۔''

''تاہم ہمارے محافظ کو کیا حق ہے کہ وہ گلی میں کسی پر حملہ کرے صرف اس لیے کہ وہ بانسری بجا رہا ہے اور گا رہا ہے۔ جاوید کو اس بات کا خوف نہیں کہ اپنی اس زیادتی کے لیے اسے نواب کے سامنے جواب دہ ہونے پڑے گا۔''

خان بیگم ہنس دی۔ ''نواب؟'' وہ بولی ''یہ تم کیا سوچ رہی ہو مریم؟ نواب بھلا ان باتوں کی کیوں پرواہ کرنے لگا؟''

کوٹھی والی کی آمد

۱۳ر ستمبر کو اتوار کی صبح تھی جب نائی جاوید کے پاس کوٹھی والی کا پیغام لے کر آیا۔ ''تمھاری چاچی نے سلام بھیجا ہے اور ساتھ ہی کہا ہے کہ وہ کل تم سے ملنے آنا چاہتی ہیں۔'' جاوید نے جواب دیا ''ارے یہ گھر چاچی کا ہے وہ جب چاہیں اس گھر کی رونق بڑھا سکتی ہیں۔'' اس قسم کے پیغامات کے لیے بڑے شائستہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

اگلی صبح کوٹھی والی میانے میں بیٹھ کر اپنے نوکروں کے ساتھ آ گئی۔ اس کے آنے کی ہمیں بے حد خوشی ہوئی کیوں کہ وہ ہمیشہ دوستانہ برتاؤ کرتی تھی۔

''لو مریم، اب کچھ وقت تم میرے ساتھ گزارو۔ تم زیادہ تر وقت کامران کے گھر پر رہتی ہو اور مجھے حسد ہوتا ہے۔ جاوید، میں ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں تو تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

''بات تو ایک ہی ہے یہاں رہیں یا تمہارے ساتھ چلی جائیں۔'' جاوید نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں؟'' کوٹھی والی نے شرارتاً پوچھا۔ ''میں تو سمجھی تھی کہ اگر وہ تمھارے پاس نہ رہیں تو تم ناراض ہو جاؤ گے۔''

''سچ تو یہی ہے۔ مگر اس سے فائدہ؟'' وہ بولا ''میرا مدعا تو لڑکی کو پانا تھا۔''

''تمھارے پاس ہی ہے وہ۔ ہے کہ نہیں؟'' کوٹھی والی نے کہا۔

''میرے سر کی قسم، تم مجھے غصہ دلا رہی ہو۔'' جاوید نے کہا۔ ''جب تک وہ میرے گھر میں ہے میرے قبضے میں ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ اگر اس کی ماں نے ٹال مٹول نہ کی ہوتی تو میں اس سے آج ہی شادی کر لیتا۔ کبھی وہ کہتی ہے۔ ''مجھے اپنے بھائیوں سے

پوچھنا ہے۔'' جیسے کہ اس کے بھائی صلاح مشورہ دینے کے لیے زندہ ہیں۔ کبھی کہتی ہے ''اس وقت تک انتظار کرو جب تک دہلی کی لڑائی ختم نہیں ہو جاتی۔'' یعنی اگر لڑائی ختم بھی ہو جاتی ہے تو ہم لوگوں کو کیا فرق پڑے گا۔ یہ سوچنا کہ فرنگی لڑائی جیت جائیں گے حماقت ہی ہے۔ کیا میں نے دیکھا نہیں جب ہمارا ایک سپاہی اُن کا پیچھا کر رہا تھا تو وہ کیسے اپنی جان بچاتے پھر رہے تھے؟''

''ہو سکتا ہے مگر ہمیشہ نہیں۔'' کوٹھی والی نے کہا۔

''میں حیران ہوں چاچی کہ تم ان کے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں جتا رہی ہو؟''

''اس لیے کہ میرے ساتھ ان کا برتاؤ اچھا رہا ہے۔'' چاچی نے جواب دیا۔ ''جب میرا خاوند دشمنوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا تو وہ کلکٹری ہی تھا جو ماتم پرسی کے لیے گھر پر آیا تھا اور اسی کی بدولت ہمارے کھیت ہم سے چھینے نہیں گئے۔ مانا کہ یہ بات اب پرانی ہو چکی ہے لیکن میں ان کا برا کیوں کر چاہوں گی مگر یہ مت سوچنا کہ میں تمھارے مقصد، میری مراد بغاوت سے ہے، اس میں کوئی برائی ڈھونڈتی ہوں۔''

''بغاوت! تم ہمیشہ اسے بغاوت ہی کیوں کہتی ہو چاچی؟'' جاوید بہت پریشان لگ رہا تھا۔ ''کسی کے خلاف بغاوت؟ غیر ملکیوں کے خلاف! کیا ان کو اس سرزمین سے نکال باہر نہیں کر دینا چاہیے۔ ان لوگوں سے لڑنا بغاوت نہیں بلکہ ایک قابلِ تعریف عمل ہے۔ ایک جنون ہے۔''

''ہو سکتا ہے مگر معصوم عورتوں اور بچوں کے قتل سے گریز رہے تو اچھا ہے اور یہ بھی دیکھو کہ فرنگی کس طرح دلّی پر اپنی گرفت مضبوط کیے ہوئے ہیں۔''

''بس چاچی آگے کچھ مت کہنا۔ نہیں تو میرے اندر کا شیطان جاگ جائے گا۔ ہمیں کوئی پیش گوئی نہیں کرنی چاہیے۔ دہلی ابھی قائم ہے اور اس پر بہادر شاہ کی حکومت ہے!''

''پھر بھی میں تمھیں یہی صلاح دوں گی کہ تم مریم کی بات مانو اور دہلی کا محاصرہ اٹھنے تک انتظار کرو۔ لیکن جاوید اس لڑکی سے متعلق اپنے ارادوں سے ذرا ہوشیار رہنا۔''

''بلا شک مجھے خبردار رہنا ہوگا۔ میں کانپور کی اس لڑکی کی کہانی سن چکا ہوں۔''

''کون لڑکی؟''

''وہ جنرل کی لڑکی تھی۔ اپنی عمر کے بیسویں سال میں بے حد خوبصورت۔ نانا صاحب کے محافظ جتھہ دار نرسنگھ نے اسے قتل عام سے بچایا تھا اور اسے اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا۔ میری طرح اس کے ارادے بھی پاک تھے۔ لیکن ایک رات ایک دوسرے افسر زرانداز خان نے اُسے جمعدار کے گھر سے اٹھا لیا اور اس کے ساتھ اس قدر ظالمانہ سلوک کیا کہ اس کی رگوں میں اپنی قوم کی خودداری اور آزادی جاگ اٹھی۔ کچھ عرصے تک اس نے اپنے جذبات کو دبائے رکھا لیکن ایک رات جب وہ سو رہا تھا تو اس کے تکیے کے نیچے سے اس نے چھوٹی تلوار نکالی اور اس کے سینے میں گھونپ دی۔ بعد میں وہ خود بھی کنوئیں میں کود گئی۔ یہ تکنی ہمت و دلیری کا کام تھا چاچی!'' اور اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے میری طرف اشارہ کیا ''یقین مانو میں نے تو ابھی اس کو جی بھر کے دیکھا بھی نہیں ہے۔''

''واہ! بہت چالاک بنتے ہو!'' کوٹھی والی نے مذاق میں کہا۔

کچھ وقفے کے بعد کوٹھی والی نے پھر کہا ''تو یہ میرے ساتھ جا سکتی ہیں نا جاوید؟ آج صبح سویرے سے تمھارا مزاج بھی کچھ بگڑا ہوا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ لے جاؤ ان لوگوں کو اپنے ساتھ۔'' اس نے آزردگی سے کہا۔ ''اگر وہ تمھارے ساتھ جانے میں خوش ہیں تو جا سکتی ہیں۔''

کوٹھی والی کے میانے میں بیٹھ کر ہم اس کے گھر پہنچے۔ دراصل وہ ایک حویلی تھی۔ کشادہ، اینٹوں سے بنی ہوئی۔ اونچا صدر دروازہ اور بڑا صحن۔ پھاٹک کے اوپر کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں جن کی چھتیں شیشے کی تھیں اور وہ مردوں کی آرام گاہ تھیں۔ عورتوں کے کمرے نچلے منزل پر تھے جو ٹھنڈے اور کشادہ تھے۔

گھر میں کوٹھی والی، اس کی لڑکی اور دو لڑکے، ایک بہو، ایک داماد اور کئی پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں تھیں۔ کوٹھی والی ضلع کے زمیندار کی بیوہ تھی اور اس وقت اس کی عمر چالیس سال تھی۔ دراز قد، کالے بال اور سیاہ آنکھیں، بڑا سا منہ، چھوٹے چھوٹے

دانت جو مسی اور پان چبانے سے کالے پڑ گئے تھے۔ دونوں ہاتھوں میں چاندی کا ایک ایک کڑا اور دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں معمولی سے چاندی کے چھلے کے علاوہ اس نے اور کوئی زیور نہیں پہنا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ہمیشہ دمکتا رہتا تھا اور وہ بہت خوش مزاج تھی۔ اپنی برادری میں اس کی بہت عزت تھی اور لوگ مصیبت میں صلاح مشورے کے لیے اس کے پاس آتے تھے۔

امی اس گھر کی چہیتی بن گئیں۔ اسی طرح آنیٹ اور میں بھی لیکن ذرا کم۔ کوٹھی والی ہمارا خاص خیال رکھتی تھی۔ ''کتنی چپ چاپ ہیں یہ لڑکیاں! اور فضول باتوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتیں۔''

ایک دن امی سے کہنے لگی: ''ان لڑکیوں کے کان اور ناک کیوں نہ چھدوا دیے جائیں؟''

''جب میرے پاس ان کے پہننے کے لیے دینے کو کچھ نہیں تو ناک کان چھدوانے کا کیا فائدہ؟'' امی نے جواب دیا۔

ہمارے کانوں کی لویں تو پہلے ہی چھدی ہوئی تھیں اور میں خوش تھی کہ میری ناک نہیں چھیدی جائے گی۔

''یہ اچھا ہوا کہ تم نے اپنی لڑکی کے لیے جاوید کی پیش کش کو نہیں مانا۔'' کوٹھی والی نے کہا۔ ''میری کوئی لڑکی ہوتی تو میں بھی نہ مانتی۔ جاوید بے حد بے وفا ہے۔''

''یہ ایک بڑا بے جوڑ رشتہ ہوتا۔'' امی نے کہا۔ ''میرا خاوند کبھی اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی بیٹی کسی پٹھان کے گھر میں دوسری بیوی بن کر رہے۔''

ہم باتیں کرتے رہے تھے کہ کوٹھی والی کا بڑا لڑکا وجیہ اللہ خان آ کر بیٹھ گیا۔ وہ پچیس سال کا نوجوان تھا اور حافظ تھا..... یعنی قرآن حفظ کیے ہوئے تھا..... اور باقاعدگی سے نماز پڑھتا تھا۔ پڑوس کی مسجد میں وہی اذان دیا کرتا تھا۔ صاف رنگ، درمیانہ قد، مسکین اور عزت آبرو والا تھا۔ وہ اکثر اوپر بیٹھک میں بیٹھ کر زیادہ تر اپنا وقت پڑھنے اور شطرنج کھیلنے میں صرف کرتا۔ شطرنج کا رواج اب کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ اپنے دوست کدو خان

کے ساتھ آیا تھا جو کوٹھی والی کو چاچی کہتا تھا۔ میں شاید اس کو پہچان رہی تھی۔ وہ بھی اس گروہ میں شامل تھا جس نے ہمیں رام جی لال کے گھر سے زبردستی نکالا تھا۔ وہ دِق کا مریض تھا جو شاید ابھی شروع ہی ہوئی تھی اور وجیہ اللہ اور کوٹھی والی دونوں امی سے اس کا علاج کرنے کو کہہ رہے تھے۔

''میں کوئی ڈاکٹر نہیں۔'' امی نے کہا ''صرف چھوٹی موٹی بیماری کا علاج کر سکتی ہوں۔ افسوس کہ اس لڑکے کے لیے میں کچھ نہیں کر سکتی۔''

''ایسا مت کہو کہ تم کچھ نہیں کر سکتیں۔'' وجیہ اللہ نے اصرار کیا۔ ''لڑکا بڑا جانباز ہے اگرچہ ابھی اسے اپنے کاموں سے شہرت نہیں ملی۔''

''اس بیچارے کا مذاق تو مت اڑاؤ۔ وہ تو پہلے ہی افسردہ ہے۔'' کوٹھی والی نے کہا۔

''نہیں۔ میں خالا کو پہلے اس کے اچھے کارناموں سے واقف کراؤں گا پھر اس کی حالت سدھارنے کے لیے مدد کے لیے کہوں گا۔''

کدو خان پہلے سے بھی زیادہ پریشان لگ رہا تھا۔ بوکھلاہٹ میں اس نے اپنا خوبصورت سر نیچے جھکا لیا۔

''پہلی بات تو یہ کہ خالا یہ وہی نوجوان ہے جس نے نواب قادر علی خان کو عیسائیوں کے مقبرے کھودنے کا مشورہ دیا تھا کیوں کہ اسے یقین تھا کہ وہاں خزانہ دبا ہوا ہے۔''

کدو خان نے سر اٹھا کر دیکھا اور بولا۔ ''مجھے ایسا بتایا گیا تھا اور وہ بزدل جس نے مجھے یہ خبر دی تھی کہتا تھا کہ جب کسی فرنگی کو دفنایا جاتا ہے تو اس کی قبر میں دو بورے بھر کر روپے رکھ دیے جاتے ہیں۔''

''اور تم نے اس بے ہودہ کہانی پر یقین کر لیا اور ان کی ہڈیاں تک کھود ڈالیں۔ بتاؤ تو کون سا خزانہ ڈھونڈ نکالا تم نے؟''

''کھدائی ہم نے رات کے وقت شروع کی تھی۔'' کدو خان نے خود ہی بتانے میں بہتری سمجھی۔ ''چاندنی رات تھی۔ ہم تین لوگ تھے۔ قبر میں اترنے کے لیے میں نے اپنی خدمات پیش کیں۔ یہ سوچ کر اگر کوئی قیمتی چیز ملی تو نکال لاؤں گا۔ اپنے دوستوں سے

رابطہ قائم رکھنے کے لیے میں نے زمین میں ایک کھونٹی گاڑ دی اور ایک رسّی اس کے ساتھ باندھ دی جس کو پکڑ کر میں قبر میں اتر گیا۔ لیکن میرے خوف کا ذرا اندازہ لگائیے۔ میرے پاؤں زمین پر نہیں پڑے اور میں دوزخ اور زمین کے بیچ میں لٹک گیا۔ میرے منہ سے ایک خوف ناک چیخ نکلی۔ میرے ساتھیوں نے یہ سوچا کہ فرنگیوں کی روحیں ان کا پیچھا کر رہی ہیں، میری مدد کرنے کے بجائے وہاں سے دُم دبا کر بھاگ نکلے اور میں قبر کے اندر جھولتا رہا۔''

''تمھارے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔'' وجیہ اللہ نے کہا۔ ''اچھا یہ تو بتاؤ تم باہر کیسے آئے؟''

''میں نے رسّی کو پکڑے رکھا اور بڑی مشکل سے کنارے پر آ گیا۔ میں اپنے ساتھیوں کے پیچھے بھاگا جیسے ہی میں نے دوڑنا شروع کیا مجھے ایسا لگا کہ کسی نے مجھے کمر سے پکڑ کر نیچے گرا دیا۔ میں نے پھر اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی اور پھر زمین پر پٹک دیا گیا۔ ڈر سے میں نیم مردہ ہو چکا تھا۔ میں نے آخری بار کوشش کی۔ اس دفعہ لکڑی کی کھونٹی بھی اکھڑ گئی اور میں وقت ضائع کیے بغیر وہاں سے بھاگ نکلا۔ چاچی قبرستان فرنگی روحوں سے بھرا پڑا ہے۔''

''بڑے ہی کوڑھ مغز آدمی ہو تم!'' وجیہ اللہ نے مزے لیتے ہوئے کہا۔ ''کوئی تو یہی سوچے گا کہ تمھاری اس کھوپڑی میں کچھ تو عقل ہوگی۔ یہ تمھارا کمر بند تھا میاں کدو جو کھونٹی کے ساتھ بندھ گیا تھا۔ اسی کی وجہ سے تم قبر کے اندر لٹکے رہے اور اسی کی وجہ سے تم پھر زمین پر پٹک دیے گئے اور جب تم نے کھونٹی کو اکھاڑ پھینکا تو تمھارا کمر بند بھی ڈھیلا پڑ گیا۔''

کدو خان کی شکست پر کوٹھی والی اور ہم سب لوگ خوب ہنسے۔

''اس بات سے تمھیں سبق لینا چاہیے کہ موت کے وقت سب برابر ہوتے ہیں۔'' کوٹھی والی نے کہا۔ ''کیا تم چاہو گے کہ خزانے کی تلاش میں تمھارے مرنے کے بعد تمھاری قبر کو کھودا جائے؟ خزانہ۔ واہ! بادشاہ لوگ بھی مرتے وقت خالی ہاتھ جاتے ہیں۔

بچہ بند مٹھی لیے پیدا ہوتا ہے اور وہی ہاتھ کھلا ہوتا ہے جب موت کا فرشتہ اسے لینے آتا ہے۔ ہم نہ تو دنیا میں کچھ لے کر آتے ہیں اور نہ کچھ لے کر جاتے ہیں۔''

اس موقع پر کدو خان کی ماں اور بہن بھی آ گئیں اور ہاتھ جوڑ کر امی سے کدو خان کا علاج کرنے کی درخواست کرنے لگیں۔

امی کے علاج کرنے کی صلاحیتوں کے بارے میں انھوں نے کچھ بڑھ چڑھ کر سن رکھا تھا۔ امی نے اسے ہر چھ گھنٹے بعد خاکسیر کی چائے پینے کا مشورہ دیا اور ترش اور گرم چیزوں سے پرہیز رکھنے کو کہا۔ ہر صبح ناریل کا پانی پینے اور کچا ناریل کھانے کا مشورہ بھی دیا۔ کدو خان نے اس معمولی سے علاج پر عمل کیا اور ہمیں پتا چلا کہ وہ آخر کار تندرست ہو گیا۔

دہلی کی شکست

ہم کوٹھی والی کے ساتھ برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ برابر کی برساتی میں جہاں کچھ مرد بھی بیٹھے تھے، کچھ ہل چل سنائی دی۔ جاوید خان گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور اس نے سرفراز کے کان میں کچھ کہا۔ سرفراز فوراً کوٹھی والی کے پاس آیا اور اس سے کچھ کہا۔ اس کے جاتے ہی کوٹھی والی نے امی سے کہا۔ ''سنو مریم دہلی پر فرنگیوں کا قبضہ ہو گیا ہے اب بہت کچھ ہونے والا ہے۔''

اس خبر کو سنتے ہی ہم لوگ خوشی سے اچھل پڑے۔ ہماری آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔ اُدھر فرنگیوں کی فتح ہو گی اِدھر ہماری قید اور ماتحتی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن دہلی چوں کہ شاہ جہاں پور سے کافی دور تھی اس لیے ہم نے اپنے جذبات پر قابو رکھا اور اس کے برعکس امی نے کوٹھی والی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''پٹھانی، اب تم بھی امن چین سے رہو گی۔''

''جاوید خان تو اپنا سا منہ لے کر رہ جائے گا! ہے نا؟'' کوٹھی والی نے خوشی سے کہا۔ اس خبر نے اس پر کوئی نمایاں اثر نہیں کیا تھا۔ اسے تو چند لوگوں سے مطلب تھا نہ کہ

برادری سے۔ لیکن اس کی پریشانی کی وجہ بھی تو ہے۔ فرنگی اس شہر میں بدلا ضرور لیں گے۔''

اگلے ہی دن مردانے میں بڑی لمبی چوڑی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ کچھ لوگ شہر چھوڑ کر بھاگ جانے کا مشورہ دے رہے تھے جب کہ دوسرے انتظار کرنے اور حالات کا جائزہ لینے کو کہہ رہے تھے۔

سرفراز کہہ رہا تھا ''دہلی پر اگرچہ فرنگی فوج کا قبضہ ہو گیا ہے لیکن ہمارے اس چھوٹے سے شہر تک پہنچنے میں انھیں کافی وقت لگے گا۔ ہمارے سپاہی جنھوں نے دہلی میں شکست کا سامنا کیا ہے دوسری جگہ مثلاً لکھنؤ میں مقابلہ کر سکتے ہیں اور شاہ جہاں پور میں کسی فوج کے پہنچنے میں تو مہینے لگ جائیں گے۔ بھاگنے کی اتنی جلدی بھی کیا پڑی ہے، جب تک انتقامی فوج سے ڈرنے کی کوئی اور خاص وجہ نہ ہو تو.....'' جاوید کہہ رہا تھا ''ہاں بالکل ٹھیک کہا تم نے بھائی۔ میں نے کوئی ڈرنے والا کام تو کیا ہی نہیں۔ کیوں؟ کیا کیا ہے میں نے؟ یہ تو عبدالرؤف جیسے لوگ تھے جو پہلے فرنگی کی نوکری میں تھے اور بعد میں باغیوں میں شامل ہو گئے۔ پھانسی تو انہی لوگوں کو لگے گی۔ جہاں تک میری بات ہے، میں نے تو فرنگیوں کا نمک تک نہیں چکھا۔ اگر بدترین صورت پیش آئے گی تو میں نیپال بھاگ جاؤں گا یا پھر گوالیار کی فوج میں نوکری کر لوں گا۔''

سرفراز: ''اوہ! مجھے یقین ہے تم ایسا ہی کرو گے۔ لیکن اگر کوئی خطرے کی بات نہیں ہے تو شہر چھوڑ کر جانے کی کیا ضرورت ہے؟''

حفیظ اللہ: ''میں نے اپنے کچھ آدمیوں کو دیکھا ہے جو دہلی سے لوٹ آئے ہیں۔ وہ بھاگ نکلنے میں خوش قسمت تھے۔ اب وہ بالکل پھٹے حال ہیں۔''

''دہلی کی جنگ کے بارے میں انھوں نے کچھ بتایا؟'' سرفراز نے پوچھا۔

''ان لوگوں نے بتایا کہ ہماری فوج انگریزی لائینوں میں جو پہاڑی پر مورچہ بند تھی، نقب لگانے میں ناکام رہی۔ بہت سے دھاوے بولے گئے۔ شہر کی تسخیر سے کچھ ہی دن پہلے آخری دھاوے میں ہمارے آدمی بڑے شجاعت اور مردانگی سے لڑے لیکن ان کو پسپا

کر دیا گیا اور ایک ایک آدمی کو مار ڈالا گیا۔ فرنگیوں کے بھی بہت سے آدمی مارے گئے۔ لیکن فتح نے ان کے حوصلے بلند کر دیے۔ جب ان کی بڑھتی ہوئی فوج فصیل کے پاس آ پہنچی اور کشمیری دروازے کو اڑا دیا تو ان کے سردار نکلسن کو ایک اونچی جگہ سے اپنی تلوار کی نوک پر رکھے رومال کو ہلاتے دیکھا گیا۔ اس کے ایک گولا لگا اور وہ وہیں گر گیا۔ لیکن اس کے آدمی سنگینوں سے لڑتے ہوئے شہر میں گھس آئے اور دہلی فرنگیوں کے قبضے میں آ گئی۔''

''بادشاہ کا کیا ہوا؟'' سرفراز نے پوچھا۔

''بادشاہ قید کر لیا گیا اور اس کے بیٹے جو اس کے ساتھ بھاگ گئے تھے گولی سے اڑا دیے گئے۔''

''تو یہ تھا جدوجہد کا اختتام'' سرفراز خان نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''دلّی شہر جو پھولوں کا گلستان تھا، اب ایک اجڑا دیار ہے، اس اجنبی شہر میں نہ ہی کوئی میرا دشمن تھا اور نہ ہی کوئی میرا دوست.....''

''زیادہ جذباتی اور شاعرمت بنو سرفراز۔'' جاوید نے چڑھ کر کہا۔ ''میرے گھر پر ان لوگوں کے قتل کے لیے کون آیا تھا؟''

''وہ میں تھا۔'' سرفراز نے کہا۔ ''لیکن کیا میں نے کسی کا قتل کیا؟''

پس پردہ

موسمِ سرما کی ابتدا تھی۔ ابھی ٹھنڈی ہوائیں چلنا شروع نہیں ہوئی تھیں۔ امی نے اپنے زیورات کے بکسے میں سے جسے میں جلتے ہوئے گھر سے نکال کر لائی تھی چاندی کے دو چمچ بیچ ڈالے تا کہ سردی سے بچنے کے لیے رضائیاں اور گرام کپڑے بن جائیں۔

جب سے ہم نے دہلی کی شکست کا سنا تھا، ہمارے نظریے اور امیدوں میں تبدیلی آ گئی تھی۔ ہم اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب شاہ جہاں پور میں پھر انگریزی حکومت قائم ہو جائے گی اور ہماری یہ قید بھی ختم ہو جائے گی جو کوٹھی والی، کامران اور ان کے گھر

کے افراد نے ہمیں محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ تاہم ہمیشہ کے لیے اس حال میں رہنا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ ہمیں امید تھی کہ ہم پھر امی اور پاپا کے خاندان کے لوگوں میں جا ملیں گے اور جاوید کا میرے ساتھ شادی کرنے کا منصوبہ بھی دھرا رہ جائے گا۔ انگریزی حکومت کے دوبارہ قائم ہونے سے ہمارا فائدہ ذاتی تھا۔ پچھلے چند مہینوں میں ہم یہ سمجھ چکے تھے کہ غیر ملکی حکومت سے لوگوں میں بے حد ناراضگی تھی اور ظاہراً آپسی حکومت کا جاری رہنا دونوں طرفین کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن فی الحال اس حکومت کا دوبارہ قائم ہونا ہمارے حق میں تھا، کیوں کہ ہماری زندگیاں اسی پر منحصر تھیں۔

لیکن ابھی تک انگریزی فوج کے پہنچنے کے لیے کوئی صورت دکھائی نہیں دی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ انگریزی فوج دیر سویر ضرور پہنچ جائے گی۔ اس لیے ہم اس موضوع پر بات تک نہیں کرتے تھے نہ ہی اس بات میں مصلحت سمجھتے تھے کہ جاننے کی کوشش کریں کہ دوسری جگہوں پر کیا ہو رہا ہے۔ کوٹھی والی کی ہمدردی پر ہمیں بھروسہ تھا لیکن خطرہ اس بات کا تھا کہ کہیں جاوید اپنی شکست و ناکامی کی وجہ سے ہم لوگوں کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔

ایک روز محلے کی جمعدارنی بیمار پڑ گئی تو اس نے ایک دوسری لڑکی کو اپنی جگہ کام کے لیے بھیج دیا۔ وہ لڑکی دیکھتے ہی ہمیں پہچان گئی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی امی سے بات ہو گئی۔ مجھے یاد ہے کہ اس کا نام ملیا تھا اور جب میں چھوٹی تھی تو اس کی چھوٹی بہن سے کھیلا کرتی تھی۔

بیت الخلا ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہم راز کی بات کر سکتے تھے اور جیسے ملیا بیت الخلاء کی دیوار کے پیچھے گئی امی وہاں پہنچ گئیں۔

''موسی، اب تمھیں ڈرنے کے کوئی ضرورت نہیں۔'' ملیا نے امی کے کان میں کہا۔ ''دلّی فتح ہو گئی ہے۔ جلد ہی تمھارے اپنے یہاں آ جائیں گے۔ میں تمھیں یہ بھی بتا دوں کہ تمھارا بھائی بھرت پور میں محفوظ ہے۔ اگر تم اس کے پاس پیغام بھیجنا چاہتی ہو تو ایک آدمی یا ترا پر متھرا جا رہا ہے، وہ تمھارا خط لے جائے گا۔''

امی کو ایک واقف کار سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور اس پر بھروسہ کرتے ہوئے قاصد کو خط دینے کے لیے وہ راضی ہوگئیں۔

''لیکن میں خط لکھوں گی کیسے؟'' امی نے پوچھا۔

''فکر مت کرو۔'' ملیا نے کہا۔ ''کل میں کاغذ پنسل لے کر آؤں گی۔ کل مجھے اسی جگہ ملنا۔''

اس مبارک ملاقات پر ہم نے اپنے احساسات کو ظاہر نہیں ہونے دیا، نہ کسی نے ہمارے برتاؤ میں کوئی تبدیلی دیکھی۔ ہم نے آنیٹ اور نانی پر بھی اس کا انکشاف نہیں کیا کہ کہیں ہماری امیدوں پر پانی نہ پھر جائے۔

اگلے روز، حسب وعدہ ملیا آئی اور پردے کے پیچھے امی کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے امی کو کاغذ کا ایک ٹکڑا اور ایک چھوٹی سی پنسل پکڑا دی۔ امی نے یہ عبارت لکھی ''میں، روتھ، آنیٹ اور امی زندہ ہیں اور یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ جیسے بھی ہو سکے ہمیں یہاں سے نکالو۔''

یہ پرچہ اس نے ملیا کو دیا جس کو اس نے اپنے بلاؤز میں چھپا لیا۔ وہ وہاں سے آنکھ بچا کر نکل گئی اور ہم نے اپنے برانگیختہ جذبات کو روکے رکھا۔

جنوری کا مہینہ شروع تھا اور کوٹھی والی کے پاس رہتے ہوئے ہمیں تین مہینے گزر گئے تھے۔ ہم نے کسی چیز کی خواہش نہیں کی۔ پھر بھی بڑی شفقت اور لحاظ سے ہمارا خیال رکھا گیا۔ یہاں تک کہ جب یہ کہا گیا کہ ہم جاوید خان کے یہاں چلے جائیں تو ہم بہت ناامید ہوگئے۔ وہ خود وہاں آیا اور کوٹھی والی سے ہمیں بھیجنے کو کہا۔ شاید اسے اب بھی امید تھی کہ مجھ سے شادی کرنے کے لیے امی کو راضی کر لے گا۔ انگریزوں کو دلّی فتح کیے ہوئے مہینوں گزر گئے تھے لیکن شاہ جہاں پور میں ان کی واپسی کی کوئی امید نہیں تھی۔

ادھر خان بیگم ہمارے لوٹنے پر خوش نہیں تھی اور وہ حسد کے مارے جلی بھنی رہتی تھی۔ لگتا تھا اس کی جاوید سے کچھ کہا سنی ہوئی تھی کیوں کہ ہمارے پہنچنے کے اگلے روز صبح جاوید اس سے غصے میں کہہ رہا تھا: ''مجھے تمھاری یہ روز روز کی چق چق پسند نہیں۔'' جس پر اس

کی بیوی نے جب بھی جواب دیا تو جاوید کی ایک چابک نے اُسے خاموش کر دیا۔

وہ کسی سے بات کیے بنا گھر سے چلا گیا اور شام کو کھانے کے وقت ہی لوٹا۔ اس نے خان بیگم سے پوچھا کہ اُس نے کچھ کھایا یا نہیں۔

''نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

''تو بیٹھو یہاں اور کچھ کھا لو۔'' وہ بولی ''اور زیادہ پھیلنا نہیں۔'' وہ جانتی تھی کہ جاوید غصے میں ہے اور اس کی چابک سے اسے ڈر لگتا تھا۔ اُس نے وہی کیا جو جاوید نے کہا چاہے وہ افسردہ اور روٹھی سی تھی۔ کوٹھی والی آئی اور ہمیں پھر اپنے ساتھ لے گئی۔

بجھ پوری کی لڑائی

اپریل ۱۸۵۸ کو وسط تھا۔ موسم سرما کی گرم ہوائیں گرد اب کے ساتھ کوٹھی والی کے برآمدے میں مار کر رہی تھیں۔ دروازے کے باہر گل موہر کے درخت پر گلنار کے پھولوں کی بہار تھی۔ آم کے درختوں پر بور آ چکا تھا اور اچھی فصل کی امید تھی۔

کوٹھی والی کے یہاں جاوید کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی اور ان دونوں میں چپکے چپکے بات ہوتی رہتی تھی۔ ہم اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھے کہ انگریزوں نے شاہ جہاں پور پر دوبارہ قبضہ کر لیا تو ہمارے ساتھ یہ لوگ کیسا سلوک کریں گے۔

ایک روز کوٹھی والی کے پاس ایک شخص آیا جسے ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا نام فیض اللہ تھا اور وہ بھی کوٹھی والی کو چاچی کہتا تھا اگرچہ اس سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا نوجوان تھا اور فتح گڑھ میں ہوئے واقعات بیان کر رہا تھا جہاں سے وہ آیا تھا۔

''تو تم بجھ پوری کی لڑائی کے وقت وہیں موجود تھے؟'' کوٹھی والی نے پوچھا۔

''ہاں چاچی۔'' وہ بولا۔ ''کتنی زبردست لڑائی تھی! ہم انگریزوں سے دست بدست لڑ رہے تھے اور انھیں اپنی طاقت کا احساس دلا دیا تھا۔ میں نے مقتولوں کا ڈھیر لگا دیا اور نواب کو پیش کرنے کے لیے اپنے ساتھ سروں کی ایک لڑی بنا کر لایا ہوں۔''

''کتنے جھوٹے ہو تم۔'' کوٹھی والی نے کہا۔

''میرے سر کی قسم چاچی۔''

''تمھارے جیسا دُبلا پتلا آدمی اتنے سر بھلا کیسے اُٹھا سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں میں نے ان کو اپنے گھوڑے پر ڈالا اور فتح کا جشن مناتا ہوا گھر پہنچا۔''

''تو لڑائی میں سب سے زیادہ نقصان کس کا ہوا؟''

''کافروں کا اور کس کا چاچی۔ ہم نے ان کا پوری طرح سے صفایا کر دیا۔'' اور اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھلی کو بائیں ہاتھ پر رکھا۔

''اچھا۔'' کوٹھی والی نے کہا۔

''ایک بھی آدمی نہیں بچا چاچی اور جانتی ہو انھوں نے کیا کیا؟ انھوں نے اپنی عورتوں کو ہم سے لڑنے کے لیے بھیجا۔''

''یہ تو بڑی حیران کن بات ہے!'' کوٹھی والی بولی۔ ''تم تو بڑے ہوشیار لڑکے ہو فیض اللہ۔ کیا تصور پایا ہے تم نے! اچھا یہ تو بتاؤ ان کی عورتیں کیسی لگتی تھیں؟''

''وہ عورتیں کیا تھیں، دیو تھیں۔ کئی عورتوں نے تو نقلی داڑھی اور مونچھیں لگا رکھی تھیں۔ لیکن ہر ایک نے اونچا لہنگا پہنا ہوا تھا اور اس پر دھات کا پترا ٹانگ رکھا تھا؛ (اچانک مجھے دھیان آیا کہ فیض اللہ اسکاٹ لینڈ کے بینڈ والوں کا ذکر کر رہا تھا) یقین مانو بڑی خوفناک قسم کی عورتیں تھیں وہ۔ ظاہر ہے ان سے لڑنے کا کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔ عورتوں پر بھلا میں کیسے ہاتھ اُٹھا سکتا تھا۔ بس متنفر ہو کر میں نے کیمپ چھوڑ دیا اور چلا آیا۔''

''یہ تم نے اچھا کیا۔'' کوٹھی والی نے کہا۔ ''فرنگیوں کے جو تم سر لائے ہو ایک دکھاؤ تو سہی۔''

''میں تمھیں ضرور دکھاتا چاچی، لیکن یقین کرو ساری کی ساری لڑی میں نے نواب کے سامنے پیش کر دی۔''

فیض اللہ کے صحیح سلامت گھر لوٹنے سے ہمیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ انھیں انگریزوں کے ہاتھوں فتح گڑھ میں شکست نہیں ہوئی ہے اور وہ وقت دور نہیں جب انگریز فوج شاہ

جہاں پور میں جلد ہی داخل ہو جائے گی کہ اسی وقت سرفراز نے داخل ہو کر اس بات کی تصدیق بھی کر دی۔ وہ نفرت بھری نظروں سے فیض اللہ کی طرف دیکھ کر بولا: ''تو یہ جانباز آپ لوگوں سے اُن فرنگیوں کے بارے میں کہہ رہا تھا جن کے سر اس نے قلم کیے۔ کیا یہ بتا سکتا ہے کہ نظام علی خان کا سر کس نے قلم کیا؟''

اس خبر نے کھل بلی مچا دی اور کوٹھی والی اچھل پڑی اور بولی ''نظام علی مارا گیا ہے! کیا تم ٹھیک کہہ رہے ہو؟''

نظام علی خان نواب کا بے حد عزیز ملازم تھا۔ اعتدال پسند اور باعزت آدمی۔ ایک دفعہ ہم نے اس کی حویلی کرائے پر لی تھی۔ ہم نے ہمیشہ اسے بڑا شائستہ اور ہمدرد پایا تھا۔

''میں بالکل درست کہہ رہا ہوں۔'' سرفراز نے کہا۔ ''میرے پاس اس بات کا ثبوت ہے۔ میں اس شیخی خورے کی طرح بڑائی نہیں مار رہا ہوں۔ نظام علی کے گھر پر صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے۔ اس کے دونوں لڑکے بھی زخمی ہو گئے ہیں۔ ایک کے سر پر چوٹ لگی ہے تو دوسرے کے ٹانگ پر۔''

فیض اللہ کا بھانڈا پھوٹ چکا تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھوں نے جو بندوق کے پٹے سے کھیل رہے تھے حرکت کرنا بند کر دی تھی۔

نواب نے نظام علی کی کمان میں ایک بڑی فوج بھیجی تھی اور ہدایت کی تھی کہ فرنگیوں کو گنگا پار کرنے سے روکے۔ لیکن وہ اس قدر سست اور بے ڈھنگے تھے کہ دشمن کی فوج دو دفعہ ہمارے شہر پر چڑھ آئی اور نظام علی کو پتا ہی نہیں چلا۔ فرنگی فوج اپنے کیمپ تک پہنچ چکی تھی جب آسمان میں انھیں گرد و غبار اڑتا دکھائی دیا۔ ان کے جاسوسوں نے آ کر خبر دی کہ نواب کی فوج نے ان پر چڑھائی کر دی ہے۔ اسی وقت گھوڑ سوار فوج کو میدانِ جنگ میں اترنے کا حکم ہوا۔ نواب کی فوج ابھی صف آرائی کر رہی تھی کہ انگریزوں نے ان پر حملہ بول دیا اور بندوقوں سے ساری فوج کا صفایا کر دیا۔ اس اچانک حملے سے ہماری فوج کے حوصلے پست ہو گئے۔ خوف و ہراس سے ان میں بھگدڑ مچ گئی۔

''اور نظام علی کا کیا ہوا؟'' کوٹھی والی نے پوچھا۔

''اس نے اپنے آدمیوں کو اکٹھا کرنے کی مایوس کن کوشش کی تا کہ وہ فرنگیوں کا مقابلہ کر سکے لیکن بے سود۔ وہ اپنے آدمیوں کو مقابلے کے لیے اکٹھا کرنے کے لیے ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔ یہ ذلت اس سے برداشت نہیں ہو پائی اور وہ گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور اپنے ملازم کو اپنے سینے میں تلوار گھونپ دینے کے لیے کہا۔ لیکن ملازم نے اس کی بات نہیں مانی، نظام علی پھر دیوانہ وار بھاگا اور جا کر توپ کے دہانے کے آگے اپنا سر رکھ دیا اور توپچی سے کہا کہ آگ کا فلیتہ لگا کر اس کو اڑا دے۔ لیکن توپچی نے بھی انکار کر دیا۔ بے چارہ نظام علی! وہ اپنے تیز چھرے سے خود پر وار کرنے والا تھا کہ فرنگی گھوڑسوار فوج ہر چیز کا صفایا کرتی ہوئی آ پہنچی۔ اس کو پہچاننا مشکل نہیں تھا۔ وہ لپک کر اس کی طرف بڑھا اور بھالا مار کر اسے زمین پر گرا دیا اور اس طرح سے ایک ایسے آدمی کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا جو عبدالرؤف خان سے زیادہ پکے ارادے اور شخصیت کا مالک تھا اور نوابی شان کو برقرار رکھے ہوئے تھا۔ میرے خیال میں نواب کی حکومت اب بس ہفتہ بھر کی اور ہے۔''

''مجھے اس کی موت کا سخت افسوس ہے۔'' کوٹھی والی نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بیٹوں کا کیا حشر ہوا؟ تم کہہ رہے تھے کہ وہ تو زخمی ہو گئے تھے۔''

''اچھا تو یہ ہوتا کہ وہ بھی اپنے عالی ظرف باپ کی طرح مارے جاتے، بدقسمتی سے وہ بھی بھگوڑوں میں شامل ہو کر تیزی سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے، جیسے میرا یہ دوست فیض اللہ۔ میں انھیں بھی سر پیٹتے اور بوڑھی عورتوں کی طرح اپنی بدقسمتی پر روتے ہوئے چھوڑ کر آیا ہوں۔''

''تم تو واقعی بڑی بھیانک خبر لے کر آئے ہو۔'' کوٹھی والی نے کہا ''اگر میں غلطی نہیں کر رہی تو فرنگی فوج جلدی ہی یہاں پہنچ جائے گی۔ اس وقت ہمارا کیا ہوگا؟''

''اس میں کوئی شک نہیں وہ ادھر کی طرف ہی بڑھ رہے تھے اور یقیناً جلدی ہی شہر پر ان کا قبضہ ہو جائے گا۔ ہمیں اپنے بچاؤ کے لیے سوچنا چاہیے..... کیوں کہ فوراً شہر کو تاخت و تاراج کرنے کا حکم جاری ہو جائے گا جیسا کہ انھوں نے دہلی میں کیا۔ ان کے

پاس یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے۔''

''خدا نہ کرے۔'' کوٹھی والی چیخی۔ ''آج سب لوگ میرے یہاں اکٹھا ہوں تا کہ بچاؤ کا کوئی راستہ نکالا جائے۔ ہمیں اب وقت نہیں ضایع کرنا چاہیے کیوں کہ کل تو فرنگی فوج ضلع میں گھس آئے گی اور پرسوں شہر میں آ جائے گی۔''

اس طرح کوٹھی والی جو بغاوت کے دوران امن و شین سے اپنے گھر پر رہی اب اپنے سردار ہونے کی صلاحیت دکھا رہی تھی۔ وہ ان بے ضابطہ اور بے ترتیب لوگوں کو اس طرح حکم دے رہی تھی جیسے وہ بچے ہوں۔ اس طرح سے ان میں اس نے تنظیم کا احساس پیدا کیا نہیں تو وہاں افراتفری کا عالم ہوتا۔

پھر وہی فرار

اس شام کوٹھی والی نے امی سے کہا۔ ''سنا مریم۔ فرنگی آ رہے ہیں۔ مجھے خوشی ہے تم میرے ساتھ ہو۔ اگر ہمیں شہر سے بھاگنا پڑا تو تم ہمارے ساتھ چلو گی۔ چلو گی نا؟''

''ہاں'' امی نے کہا۔ ''وہ لوگ کیسے جانیں گے کہ ہم کون ہیں؟ ان میں ہمارا کوئی تو ہوتا نہیں جو ہمارا استقبال کرے گا اور ہماری حفاظت کرے گا۔ ہمارے رنگ و روپ اور ہماری پوشاکوں سے کوئی بھی ہمیں مسلم سمجھ سکتا ہے اور ہمارا حشر بھی وہی ہوگا جو دوسری عورتوں کا۔ ابھی تو ہماری شناخت تم سے ہے۔ اس لیے جہاں تم جاؤ گی ہم تمھارے ساتھ چلیں گے۔''

جب کوٹھی والی نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ شاہ جہاں پور چلے جائیں گے لیکن پہلے جاوید خان کے گھر پر سب اکٹھا ہوں گے۔ اسی شام ہم جاوید کے گھر پر چلے گئے۔ ۲۸/اپریل ۱۸۵۸ء کے دن لگ بھگ تیس لوگوں نے ڈیرہ ڈال دیا۔ ان میں کوٹھی والی کے گھر کے لوگ، کامران کا کنبہ، ایک ڈاکٹر اور اس کے بال بچے جن کو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور جاوید اور اس کے گھر کے لوگ تھے۔ اس واقعے کو تقریباً ایک سال ہو گیا تھا جب ہم جلتا ہوا گھر بار چھوڑ کر آئے تھے۔ بہت جلد جاوید کا گھر بھی جل جائے گا۔ اب سب بے

معنی تھا اور میں سوچتی ہوں کہ عام آدمی کے لیے لڑائی بے معنی ہے۔

اس رات ہم سو نہیں پائے کیوں کہ دیر تک ایک کے بعد ایک میانہ اترتا رہا اور ہر کوئی کانا پھوسی اور راز کی باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ یہ طے پایا کہ ہم لوگ شمال کی جانب جائیں گے، کیوں کہ انگریزی فوج جنوب کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس لیے ۲۹ر تاریخ کی صبح کو لوگوں نے میانوں میں بیٹھنا شروع کر دیا۔

ہمارا خیال تھا کہ ہمیں ایک میانے میں جگہ مل جائے گی لیکن جلد ہی سارے میانے بھر چکے تھے اور اب ان میں مزید جگہ نہیں تھی۔

جاوید ہمارے پاس آیا اور بولا: ''مریم تم لوگ تو ڈاکٹر کی بیل گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ وہاں آرام رہے گا۔''

ہمارے لیے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہم چاروں نانی، امی، آنیٹ اور میں بیل گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہمارے ساتھ ڈاکٹر کی بیوی، دو سالیاں اور اس کے بھائی کی بیوی اور بچے تھے۔ قافلہ چل پڑا۔ مرد لوگ آگے آگے گھوڑوں پر تھے، جب کہ میانہ بردار آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ سب سے پیچھے ہماری بیل گاڑی چل رہی تھی۔

تقریباً دو گھنٹے بعد ہم لوگ ایک گاؤں میں پہنچے جو شاہ جہاں پور سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ سورج سر پر آ گیا تھا۔ ہم نے بیل گاڑی کی چھت پر لگے کپڑے کو ہٹایا تو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہم اکیلے تھے۔ گھوڑ سوار اور میانہ بردار سب غائب تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہمارے کوچوان نے کوئی پھیر دار راستہ اختیار کیا تھا اور ہم پیچھے رہ گئے تھے۔ ہم ایک اجنبی گاؤں میں آ گئے تھے ان ساتھیوں کے ساتھ جن کو ہم جانتے تک نہیں تھے۔ ڈاکٹر آرام کرنے کے لیے کسی خالی مکان کی تلاش میں تھا لیکن کوئی مکان نہیں ملا۔ گاؤں والوں نے ہماری حالت پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ ہم سے کہا کہ ہم اس گاؤں میں نہیں ٹھہر سکتے۔ لیکن ڈاکٹر نے ہمت سے کام لے کر ان کو اس بات پر راضی کیا کہ ہم چاہے کوئی بھی ہوں مگر یہ ان کا فرض بنتا ہے کہ ہمیں پناہ دیں۔ آخر کار وہ ڈاکٹر سے بولے ''حقیقت تو یہ ہے کہ گاؤں میں کوئی خالی مکان نہیں ہے۔ ہاں ایک بات کر سکتے ہو۔ گاؤں کے جنوبی

کنارے پر برگد کے درخت کے سامنے ایک نیا مکان بن رہا ہے جو ابھی نامکمل ہے مگر رہنے کے لائق ہے۔ تم اس مکان میں کچھ وقت کے لیے رہ سکتے ہو۔'' ہم خوشی خوشی بیل گاڑی سے نیچے اترے اور گارے سے بنے ہوئے اس ڈھانچے میں داخل ہوئے۔ اس میں ایک طرف ایک ہی لائن میں کئی کمرے تھے۔ آگے صحن اور چاروں طرف دیوار تھی۔

ایک طرح سے ہم ڈاکٹر اور اس کی بیوی کے مہمان تھے اور وہ ہم پر بڑے مہربان تھے۔ ڈاکٹر بنگالی مسلمان تھا اور شاہ جہاں پور کی رجمنٹ میں ملازم تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں جب رجمنٹ نے بریلی کی طرف کوچ کیا تو اس نے اس سے قطع تعلق کر لیا اور شہر میں کرائے کے مکان میں رہنے لگا جہاں اس کا ڈاکٹری کا پیشہ اچھا چل نکلا کیوں کہ اس کے ہاتھ میں شفا تھی۔

ڈاکٹر کی سالیاں گڈھا کھود کر ایک تندور بنانے میں لگ گئیں۔ ایک نے آگ جلا کر اس پر دال چڑھا دی اور دوسری آٹا گوندھ کر چپاتیاں بنانے لگی۔ شام کو کھانا کھانے کے بعد ڈاکٹر آ کر بیٹھ گیا اور بری شائستگی سے امی سے پوچھنے لگا کہ وہ کون ہیں اور کس صورتِ حال سے گزر رہی ہیں۔ امی نے اسے سارا قصہ سنایا۔ تمام حالات سن کر اسے ہم لوگوں پر بہت ترس آیا اور وہ ہمارے لیے ہمدردی محسوس کرنے لگا۔

''کیا خیال ہے آپ کا'' امی نے پوچھا۔ ''کیا واقعی انگریزی حکومت دوبارہ قائم ہو جائے گی؟''

''میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ کب ہو گی لیکن یقیناً ان کی حکومت پھر سے قائم ہو جائے گی۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں چوں کہ اب آپ ہمارے ساتھ ہیں، اس لیے آپ ہم پر بھروسہ رکھیں اور کوئی کام ہو تو کہنے میں جھجکیں نہیں۔ اس وقت ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ جہاں تک ہو سکے ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے۔''

امی ڈاکٹر کے خوش خلق رویے سے بہت متاثر تھیں۔ ہم نے ایک رات اور اگلا دن اس کے ساتھ گزارا۔ سورج چھپنے کے کافی دیر بعد جب ہر طرف سناٹا تھا اور برگد کے درخت پر پرندوں کی چہچہاہٹ بند ہو گئی تھی، ڈاکٹر امی کے پاس آیا اور بولا: ''جاوید خان

آیا ہے اور آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

''اب کس لیے آیا ہے وہ؟'' امی نے پوچھا۔ ''اب اسے ہم سے کیا کام ہے؟''

''وہ آپ سے ملنے کے لیے بے تاب ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''وہ یہاں اندر تو نہیں آسکتا لیکن آپ دروازے پر ہی اس سے بات کرسکتی ہیں۔''

امی جاوید خان سے ملنے کے لیے چلی گئیں اور میں پرتجسس انداز میں ان کی باتیں سننے کے لیے دیوار کے سائے میں کھڑی ہوگئی۔

''مریم'' جاوید بولا۔ ''میں تمھیں یہ بتانے آیا ہوں کہ فرنگیوں نے شاہ جہاں پور پر پھر قبضہ کرلیا ہے۔ تم ان کے پاس پہنچ جاؤ گی لیکن جو حفاظت میں نے تمھاری کی ہے اس کو بھولو گی تو نہیں۔''

''نہیں بھولوں گی۔ ہمیں پناہ دینے کے لیے تمھارا بہت شکریہ۔'' امی نے کہا۔ ''میں کوٹھی والی اور کامران کی مہربانیوں کو بھی نہیں بھولوں گی۔''

''مجھے تم سے فقط ایک درخواست کرنی ہے۔'' جاوید کبھی ایک پیر تو کبھی دوسرے پیر پر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''کہو کیا ہے۔'' امی نے پوچھا۔

''میں بخوبی جانتا ہوں کہ تمھاری بیٹی سے شادی کرنے کا وقت اب نکل چکا ہے۔'' وہ بولا۔ ''اب اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جانے سے پہلے مجھے ایک بار اسے دیکھنے کی اجازت تو دو گی؟''

''اس سے کیا ہوگا؟'' امی کہہ رہی تھیں لیکن کسی انوکھی ترنگ کے زیرِ اثر میں روشنی میں آگئی اور جاوید خان کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

وہ ایک منٹ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا اور پہلی بار میں اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہی۔ بنا مسکرائے اور کچھ کہے بغیر وہ مڑا اور گھوڑے پر سوار ہوکر رات کے اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

آخری سفر

اگلی صبح ڈاکٹر نے امی سے کہا ''میں نے سنا ہے کہ کل انگریزی فوج شاہ جہاں پور

میں داخل ہوگئی ہے اور شہر میں دیوانی حکومت قائم ہوگئی ہے۔ اب جب کہ امن بحال ہوگیا ہے تو کیا آپ ان کے پاس جائیں گی؟''

''مشورہ تو معقول ہے۔'' امی نے کہا ''لیکن ہم وہاں کس کو پہچانیں گے؟''

''آپ اپنے اندازِ گفتگو، بول چال اور وضع قطع سے فوراً پہچانی جائیں گی۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ آپ کا اپنا کوئی رشتہ دار آگیا ہو اور آپ کو تلاش کررہا ہو۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

اس کے بعد ڈاکٹر گاؤں کے مکھیا کے پاس گیا۔ ان کو بتایا کہ امی حقیقت میں یورپی خاتون ہیں جو قتلِ عام سے بچ نکلی تھیں اور اب وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ شاہ جہاں پور جانا چاہتی ہیں چوں کہ دیوانی حکومت پھر سے قائم ہوگئی ہے تو کیا کوئی اپنی بیل گاڑی میں اُن کو وہاں لے جاسکتا ہے؟''

''تم ہمیں کوئی نئی بات نہیں بتا رہے ہو۔'' مکھیا نے کہا۔ ''جیسے ہی وہ لوگ تمھاری بیل گاڑی سے اترے تھے، ہم سمجھ گئے تھے کہ وہ کون ہیں۔''

''تم کیسے جان گئے تھے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''تم مجھے کدو سمجھ رہے ہو؟'' بزرگ بولا۔ ''اُن کی چال ڈھال اور ان کی بات چیت سے ہمیں پتا چل گیا تھا۔ ان کی ٹانگوں کو دیکھنے سے پتا چلتا تھا کہ یہ ننگے پاؤں زمین پر چلنے لائق تک نہیں ہیں۔ اس تپتی ریت پر ڈرتے ڈرتے قدم رکھنا اس کا ثبوت تھا۔ تو اب وہ شاہ جہاں پور واپس جانا چاہتی ہیں؟ ٹھیک ہے میں، گنگا رام، خود ان کو اپنی بیل گاڑی میں لے جاؤں گا اور شاہ جہاں پور میں جس جگہ کہیں گی پہنچادوں گا۔ کل صبح میں تیار رہوں گا۔''

ہم نے اپنا مختصر سا سامان اکٹھا کیا اور اگلے دن گنگا رام کی بیل گاڑی میں بیٹھ کر شاہ جہاں پور کے لیے روانہ ہوگئے۔

سفر میں کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا۔ دوپہر کے بعد ہم قصبے میں پہنچ گئے تھے۔ ہم نے گنگا رام سے اپنے پرانے گھر پر چھوڑنے کے لیے کہا کیوں کہ ہمارے پاس اور کہیں جانے کی جگہ نہیں تھی۔ جونہی ہم اپنے پرانے مکان کے کھنڈر کے پاس رُکے ہماری

ملاقات مسٹر ریڈ مین سے ہوئی جس نے امی کو بتایا کہ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ کیسے بچ نکلا تھا۔اس نے بتایا کہ انگریز کمانڈر نے پورے ضلع پر پھر قبضہ کرلیا ہے۔وہ خود بریلی کی طرف بڑھ گیا ہے اور کرنل ہال کی کمان میں ایک مختصر سی فوج شاہ جہاں پور میں چھوڑ دی ہے۔اس نے یہ بھی بتایا کہ شہر ابھی خطرے سے خالی نہیں کیوں کہ شہر کی مشرقی حد پر ابھی بھی فیض آباد کے مولوی کا قبضہ ہے۔اس نے ہمیں اس کوارٹر میں رکنے کے لیے مشورہ دیا جس میں وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔امی نے ہچکچاتے ہوئے اس کے مشورے سے اتفاق کیا اور ہم ایک رات کے لیے اسی مکان میں چلے گئے جس میں ریڈ مین پناہ گزیں تھا کیوں کہ ابھی ہم بے گھر تھے اور ہمارے مکان میں چلے گئے جس میں ریڈ مین پناہ گزیں تھا کیوں کہ ابھی ہم بے گھر تھے اور ہمارے ساتھ کوئی مرد بھی تو نہیں تھا۔یہاں ہماری ملاقات تین آدمیوں سے ہوئی جن کے ماموں نے بھرت پور سے ہمیں لانے کے لیے بھیجا تھا۔ہمیں پتا چلا کہ ملیا کے ذریعے بھیجا ہوا پیغام ماموں کو مل گیا تھا اور اس نے فوراً ہمیں بچانے کے لیے اقدام کر لیے تھے۔امی اپنے بھائی کی تحریر دیکھ کر اور شفقت وتشویش بھرا خط پڑھ کر جس میں اس نے بھرت پور آنے کی دعوت دی تھی رو پڑیں۔اُس نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس کے ساتھ وہ اپنی باقی ماندہ زندگی بسر کرسکتی ہیں۔

۳ رمئی ۱۸۵۸ء کو اتوار کا دن تھا کہ صبح ہی صبح پلّو کی ماں پلّو کے بغیر ہمارے پاس آئی۔وہ اس قدر پریشان تھی کہ ہم سمجھے پلّو مارا گیا۔لیکن بعد میں ہمارے کہنے پر اس نے بتایا کہ پلّو نے اپنی مرضی سے وہیں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔منگل خان سے اسے اتنا اُنس ہوگیا تھا کہ اس نے آنے سے انکار کردیا۔اس کی ماں اکیلی ہی چلنے کو تیار ہوگئی تھی، یہ سوچ کر وہ نرم پڑ جائے گا اور اس کے پیچھے چلا آئے گا لیکن وہ نہیں آیا۔اسے پٹھان کا ساتھ اچھا لگا تھا اور وہ اس کے گھر میں ہی رہتا رہا۔ہمیں اس کا یہ رویہ پسند نہیں آیا۔

ہم پلّو کی ماں کی دکھ بھری کہانی سن رہے تھے کہ مسٹر ریڈ مین کرنل ہال کے کیمپ سے لوٹ آیا اور ہمیں ناشتے کے لیے بلا بھیجا۔ابھی ہم دو لقمے ہی منہ میں ڈال پائے تھے کہ اچانک شور مچ گیا کہ فیض آباد کی مولوی کی کمان میں باغی فوج دریائے کھناٹ کو

کشتیوں کے پل سے پار کر رہی ہے۔ماموں کا ملازم نسیم خان جو اپنے گھوڑے کو دریا پر نہلانے لے گیا تھا دوڑا ہوا آیا اور خبر دی کہ دشمن نے کرنل کی مختصر سی فوج پر جو پرانی جیل میں پڑی تھی حملہ بول دیا ہے۔تمام فضا لڑائی سے گونج رہی تھی۔لڑائی کے بگل بج اُٹھے تھے۔گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔میدان میں بے سوار لوگوں کی تلواروں کی کھنکھناہٹ کی آواز، بندوقوں کے چلنے کی آواز اور ادھر ادھر بھاگتے ہوئے لوگوں کا پریشان کن شور، ان سب سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ ایک کثیر فوج نے انگریزوں کے چھوٹے گروہ پر حملہ بول دیا ہے۔

ہمارے پاس اپنی حفاظت کے لیے وقت بہت کم تھا۔گنگا رام کی بیل گاڑی ابھی ہمارے پاس ہی تھی۔ریڈ مین نے اگرچہ امی کو یقین دلایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں لیکن امی نے گاؤں واپس جانے کا فیصلہ کرلیا تھا جہاں وہ سوچتی تھیں ہم محفوظ رہیں گے۔نانی، امی، میں، آنیٹ، پلّو کی ماں اور ریڈ مین کی لڑکی وِکی ہم سب بیل گاڑی میں سوار ہوگئے۔ابھی ہم احاطے کے دروازے سے باہر ہی نکلے تھے کہ ہمیں کچھ شور سنائی دیا۔کوئی دس بارہ گرد اڑاتے ہوئے باغی سوار ہوا میں تلواریں گھماتے ہوئے تیزی سے ہماری طرف بڑھے اور بیل گاڑی کو گھیر لیا۔اُن میں سے ایک کہہ رہا تھا: ''کچھ تو یہ رہے، ختم کردو ان کو۔'' ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی وہ ہمارے سر سے نقاب ہٹا دیں گے اور چمکتی ہوئی تلواریں ہمارے سینے میں اتار دیں گے۔معصوم وِکی نے دونوں ہاتھ اپنی گردن میں ڈال لیے اور بولی ''سب اپنے اپنے ہاتھ گردن میں ڈال دیں تاکہ صرف ہماری انگلیاں ہی کٹیں اور گردنیں بچ جائیں۔'' امی کے سوا سب گھبرائے ہوئے تھے۔ان کی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ان کے چہرے پر مہینوں کی تکلیف کے غم نمایاں تھے اور تذبذب سے جھریاں پڑ گئی تھیں۔انھوں نے چھرا ہاتھ میں لے لیا اور دوسرے ہاتھ سے پردہ ہٹا کر اپنا سر باہر نکالا۔ان کی صورت کو دیکھ کر وہ بدمعاش جو ہمارے خون کے پیاسے تھے خوف زدہ ہوگئے اور انھوں نے لگامیں کھینچ لیں۔

''کیا چاہتے ہو ہم سے نوجوانو؟'' امی نے پوچھا۔''اپنی عزت کو بچانے اور موت

کے خوف سے شہر کو چھوڑ جانے میں یہ مجبور عورتیں کوئی انوکھی بات نہیں کر رہی ہیں۔''

وہ اور کچھ سننے کے لیے نہیں رُکے۔ یقین کرتے ہوئے کہ ہم مسلمان ہیں اور شہر چھوڑ کر جا رہی ہیں وہ مڑ گئے اور نسیم خان کو پکڑ لیا جو ہمارے پیچھے گھوڑے پر سوار تھا۔ اس نے اپنے حواس قائم رکھتے ہوئے کہا کہ وہ دیندار ہے بیل گاڑی میں بیٹھی عورتیں اس کی رشتہ دار ہیں جو شہر کو چھوڑ کر جا رہی ہیں کیوں کہ فرنگیوں نے شہر پر قبضہ کر لیا ہے۔

سپاہی جب چلے گئے تو گنگا رام بیل گاڑی سے اتر کر ہاتھ جوڑ کر امی کے روبرو کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''خوب، جسمانی طور پر تم چاہے کمزور ہو مگر تمھارے اندر دیوی کی سی ہمت ہے۔ میری نظر میں کوئی اور عورت نہیں جوان لوگوں سے نپٹ سکتی تھی۔''

خطرات کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ ابھی ہم تھوڑی دور ہی چلے تھے کہ بیل گاڑی ٹوٹ کر ایک طرف گر گئی۔ اس کی دھری ٹوٹ گئی تھی۔ اس کی مرمت بھی ناممکن تھی۔ ہمیں ہر حالت میں آگے بڑھنا تھا تاکہ ہم پھر کہیں کسی دوسرے فوجی دستے کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ توپوں کے گولے کی گھر گھر، بندوقوں کی چلنے کی آواز اور سپاہیوں کی چیخ و پکار ہمارے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ ہم نے بیل گاڑی سے اتر کر گنگا رام کو الوداع کہا اور پیدل چل پڑے۔ ہمیں کچھ پتا نہیں تھا کہ ہم کدھر چل رہے ہیں۔ لیکن ہمارا ارادہ جہاں تک ہو سکے لڑائی کے میدان سے دور نکل جانے کا تھا۔

تپتی ہوئی دھوپ میں ایک گھنٹہ چلنے کے بعد ہمیں بڑی سڑک پر سامان سے لدی ہوئی کچھ گاڑیاں ملیں۔ وہ انگریزی فوج کی تھیں اور ہماری طرح بریلی جا رہی تھیں۔ ایک سکھ محافظ نے ہمیں دیکھا اور اس کو ہم پر ترس آ گیا۔ امی کو تیز بخار تھا اور وہ کہہ رہی تھیں کہ انھیں وہیں چھوڑ دیا جائے اور ہم جا کر کسی محفوظ جگہ کی تلاش کریں۔ نسیم خان گھوڑے سے اترا اور اس نے امی کو گھوڑے پر بٹھا دیا اور انھیں سہارا دیتے ہوئے خود پیدل چلنے لگا۔ اسی اثنا میں ایک اور حادثہ پیش آیا۔ نسیم خان گھوڑے سے اتر رہا تھا کہ اچانک اس کی پستول چل گئی اور ہم پھر دہشت میں پڑ گئے۔

●●●